سعدیہ چوہدری

مکمل ناول

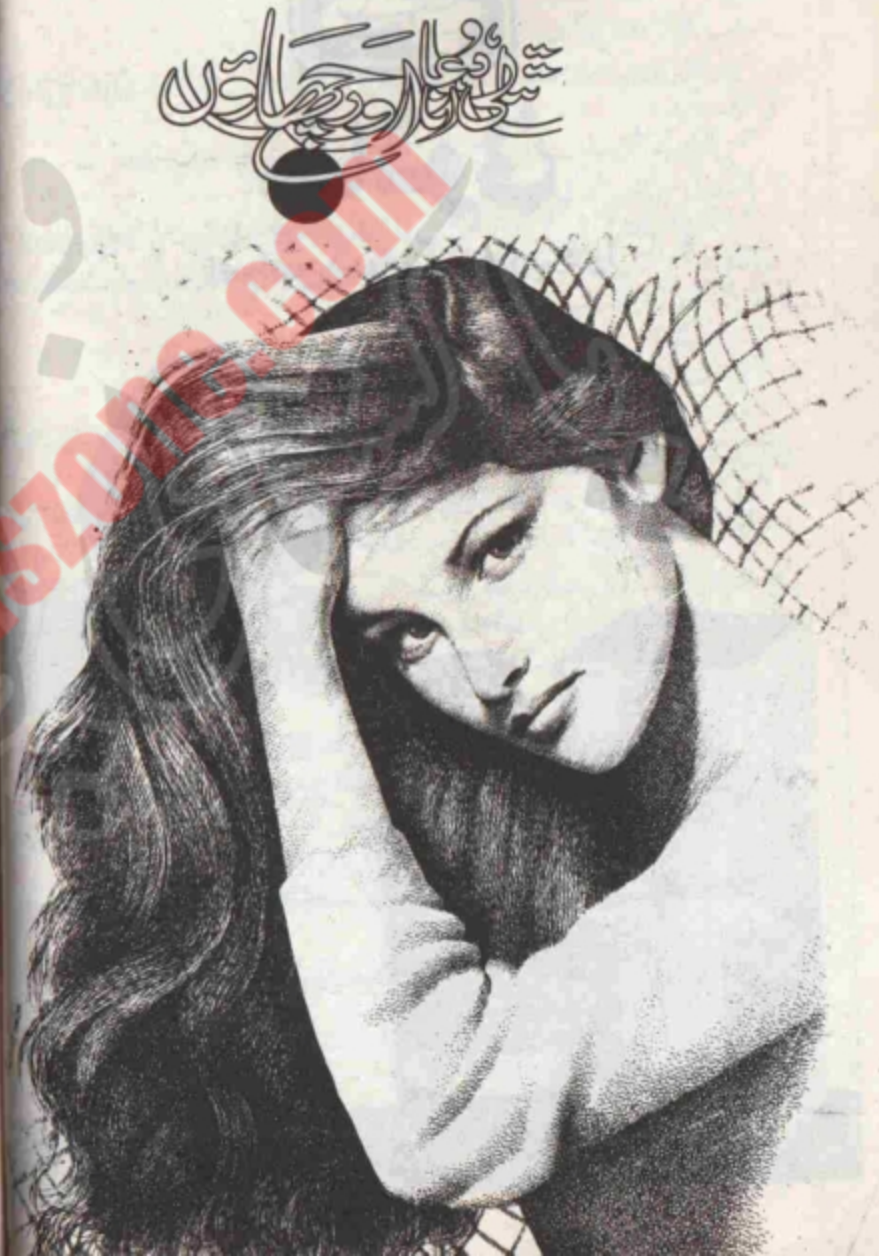

کبھی کبھی زندگی میں ہم کسی شخص کو اپنے لیے زندگی جتنا اہم بنالیتے ہیں جو ہمارے لیے سب لوگوں سب رشتوں سے پہلے ہوتا ہے۔ جس کے پاس ہم نے اپنی سانسیں اپنی سوچیں اور اپنے فیصلے گروی رکھے ہوتے ہیں اور ایک دن ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ شخص تو خائن تھا اور جب ہم اس سے اپنی ذات کو آزاد کروانا چاہتے ہیں تو ہمیں ہماری امانت لوٹانے سے پہلے وہ ہماری سانسوں سوچوں اور فیصلوں میں اپنی مرضی سے کٹوتی کرتا ہے۔ سود طلب کرتا ہے اور پھر ہمیں ہماری ذات ہمارا وجود واپس لوٹا دیتا ہے۔ لیکن تب وہ خالی وجود ہمارے لیے بے کار ہوتا ہے۔ وہ اپنا حسن اپنی سچائی اور سب سے بڑھ کر اپنا اعتماد کھو چکا ہوتا ہے۔ اور اس نقصان کے بعد ساری زندگی ہم جیتے تو ہیں لیکن یوں جیسے جینا ایک رسم ہو محض ایک رسم۔ پھر ہم ساری زندگی چاہتے ہوئے بھی خود پر اعتبار نہیں کرپاتے۔

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی ایک دن میرے ساتھ بھی یہ کھیل کھیلے گی اور میری حیات میرے لیے ایک رسم بن کر رہ جائے گی ایک بے مقصد رسم۔۔۔۔

☼ ☼ ☼

میں "انا" ہوں "انا آفندی"۔ "ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو صرف عزت اور غیرت کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے" جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد اسی ماحول کو دیکھا تھا۔ دادا جان تایا جان بہت سے اور لوگ۔۔۔۔ میں نے سب کو ایک ہی روپ میں دیکھا تھا لیکن ان میں ایک شخص تھے میرے بابا "اسفندیار آفندی" سب سے الگ سب سے جدا وہ اس زمین کے تو لگتے ہی نہیں تھے انہوں نے میرا نام "انا" ضرور رکھا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے اس بے جان جذبے کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔ ہمیشہ انہوں نے میرے لیے اچھا سوچا اور بہترین فیصلہ کیا۔

مجھے اپنے بچپن کی کچھ کچھ باتیں یاد ہیں اور کچھ بوا

7urdunovelszone.com

نے بتائی ہیں بوا میری آیا ہیں۔ مما کے جانے کے بعد وہی میرا خیال رکھتی تھیں۔ جب میں دس سال کی تھی تو میری ممانی فوت ہوگئی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھیں نہ ہی پڑھی لکھی تھیں۔ جب وہ بابا کے پاس کھڑی ہوتی تھیں۔ تو کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ ان کی بیوی ہیں۔ بابا بہت ہینڈسم ہیں۔ ان دنوں تو وہ اور بھی خوبصورت ہوتے تھے۔ آکسفورڈ سے پڑھے ہوئے میرے بابا بالکل شہزادوں کی سی آن بان رکھتے تھے۔ زیادہ وقت وہ شہر سے باہر گزارتے تھے اور میں ہمیشہ ان کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

حویلی میں، صرف میں اور مما ہوتے تھے اور دادا جان کے زیر عتاب رہتے تھے۔ دادا جان بہت سخت گیر طبیعت کے مالک تھے۔ پوری حویلی میں ان کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا۔ زین لالہ سے وہ بہت پیار کرتے تھے لیکن مجھے دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ میں اور مما ہر وقت سہمی سہمی سی رہتی تھیں لیکن جب بابا حویلی آتے تو پھر میرا سارا خوف دور ہو جاتا تھا، صرف بابا ہی تھے جو دادا جان کے کسی فیصلے سے اختلاف کر سکتے تھے، کسی اور میں اتنی جرات نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ بابا کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا ہونا تھا۔ وہ بہت بہادر تھے، ایک بار کسی بات پر ڈٹ جاتے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتے اور ان کے اکثر فیصلے دادا جان کے مخالف ہوتے تھے، جب میں تین سال کی تھی تب بھی انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا، حویلی کے دو حصے کرنے کا فیصلہ۔ اس وقت بہت ہنگامہ ہوا تھا۔ بوا بتاتی ہیں کہ بابا نے دھمکی دی تھی کہ یا تو حویلی کے دو حصے ہوں گے یا پھر وہ حویلی چھوڑ کر چلے جائیں گے اور پھر وہی ہوا۔ تایا ابو اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے حصے میں شفٹ ہوگئے۔ شاید دادا جان نے لاڈلے بیٹے کی جدائی سے بچنے کے لیے یہ فیصلہ مجبوراً کیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ بابا سے ناراض بھی رہے پھر یہ ناراضی ختم ہوگئی لیکن پھر بھی دادا جان کو بابا کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا اسی لیے وہ بابا کے ہر فیصلے کی مخالفت ضرور کرتے تھے۔

بابا ہمیشہ وہ فیصلہ کرتے تھے جو ان کا دل چاہتا تھا۔ چاہے وہ کسی کو پسند آئے یا نہ آئے جب میں چار سال کی ہوئی تھی تو بابا نے اعلان کر دیا کہ وہ مجھے بھی زین لالہ کی طرح پڑھنے کے لیے مری بھیجیں گے اور بابا کے اس فیصلے سے حویلی میں جیسے طوفان آگیا تھا، گھر میں ہر کسی نے ان کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی حتیٰ کہ مما نے بھی۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا بالکل رواج نہیں تھا۔ کجا کہ انہیں پڑھنے کے لیے باہر بھیجا جائے۔ اس لیے بابا کی جتنی مخالفت ہو سکتی تھی، وہ کی گئی لیکن ہمیشہ کی طرح بابا نے اپنے فیصلے کو منوا کر چھوڑا تھا۔ ایک طویل سرد جنگ کے بعد وہ یہ مقدمہ جیت گئے تھے لیکن اس جنگ میں انہوں نے اپنے بھائی کو کھو دیا تھا۔ بوا بتاتی ہیں کہ تب تایا ابو نے بڑی نفرت سے کہا تھا کہ "اسفندیار آفندی کو اپنے اس فیصلے کا ثمر تب ملے گا۔ جب خود اس کی بیٹی اس کے مقابلے میں آ کھڑی ہوگی۔" بوا کی بتائی ہوئی اس بات کو میں زندگی میں کبھی بھول نہیں سکی۔ جیسے جیسے مجھے اس کا مفہوم سمجھ میں آتا گیا، میں خود سے یہ وعدہ کرتی رہی کہ تایا ابو کی اس بات کو میں غلط کر کے دکھاؤں گی۔ اس ایک فقرے نے بہت دیر تک مجھے لڑنے کا حوصلہ دیا۔ آگے بڑھنے کی ہمت دی۔

☼ ☼ ☼

میں اور زین لالہ مری میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں بھی ہم اکٹھے ہی حویلی واپس آتے تھے اور جب ہم حویلی میں داخل ہوتے تو مما آگے بڑھ کر زین لالہ کا ماتھا چومتیں اور دیر تک انہیں خود سے لپٹائے رکھتیں، میرا بھی بہت دل چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھی اسی طرح پیار کریں لیکن بہت دیر بعد جب انہیں میرا خیال آتا تو بھی وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتیں، انہوں نے کبھی میرا ماتھا نہیں چوما تھا۔ پھر ایک دن بابا نے مما کو ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس دن پہلی بار میں نے دیکھا کہ انہوں نے مما سے سخت لہجے میں بات کی ورنہ وہ شاذ و نادر ہی ان سے مخاطب ہوتے

تھے۔ وہ مما سے کہہ رہے تھے۔

"زینب! اپنے رویے کو تبدیل کر لو، میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ تم میری بیٹی کو کسی احساسِ کمتری کا شکار بناؤ۔ تمہارے لیے انا، زین جتنی اہم ہونی چاہیے۔"

اور تب بابا مجھے اتنے اچھے لگے تھے کہ میرا دل چاہا کہ میں دوڑ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاؤں اور وہ مجھے اپنی گود میں لے کر گول گول گھمائیں۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ زین لالہ سے حسد محسوس کرتی تھی۔ لیکن اس دن کے بعد مجھے ان پر ترس آنے لگا تھا۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ بابا مجھے ان سے زیادہ پیار کرتے ہیں، میری خواہش تھی کہ بابا کی طرح مما اور دادا جان بھی مجھے اتنا ہی پیار کریں۔

اس دن کے بعد مما نے تو اپنا رویہ میرے ساتھ بہت تبدیل کر لیا تھا لیکن دادا جان ابھی بھی ایسے ہی تھے۔ انہیں میرا ہنسنا، کھیلنا، حویلی سے باہر جانا، پڑھنا اور شاید میرا ہونا بھی برا لگتا تھا۔ اپنے بچپن کی جتنی باتیں بھی مجھے یاد ہیں، ان سب میں دادا جان کا خوف چھایا ہوا ہے۔ شاید اپنا سارا بچپن ہی میں نے دادا جان سے ڈرتے ہوئے، ان کا حکم مانتے ہوئے گزارا تھا۔

زین لالہ اب بھی مزے میں تھے۔ وہ دادا جان کی گود میں سر رکھ کر اپنی ساری فرمائشیں پوری کرواتے تھے مجھے جلا جلا کر مزے مزے کی چیزیں کھاتے تھے۔ وہ بالکل دادا جان کی طرح ہو گئے تھے۔ ان ہی کی طرح مالی معاملوں پر غصہ کرتے، ہر نوکر پر حکم چلاتے تھے۔ ہر ہفتے کے اختتام پر وہ دادا جان کے ساتھ شکار کے لیے بھی جاتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ان کی ساری باتیں بابا سے کروں لیکن وہ دیر سے حویلی آتے اور ان کے آنے کی خوشی میں میں سب کچھ بھول جاتی۔

پھر ایک دن جب لالہ، پامیں باغ میں کسی فاختہ کا نشانہ لگا رہے تھے، عین اسی وقت بابا حویلی آگئے۔ ایئر گن کی آواز پر جو انہوں نے باغ میں جا کر دیکھا تو لالہ کے ایک ہاتھ میں ایئر گن اور دوسرے میں زخمی فاختہ لیے کھڑے تھے۔ وہ رنگے ہاتھوں موقع واردات سے گرفتار ہو گئے تھے۔ پھر تو جیسے زین لالہ کی شامت آگئی۔ بابا کو میں نے پہلی بار اتنی اونچی آواز میں بولتے سنا تھا اور پہلی بار بابا کے ہاتھوں لالہ کی پٹائی ہوئی تھی۔ اس وقت دادا جان گھر پر نہیں تھے ورنہ انہیں ضرور روکتے۔ خیر روکا تو مما نے بھی تھا لیکن بابا نے یہ کہہ کر انہیں چپ کروا دیا کہ وہ بہتر جانتے ہیں کہ انہیں اپنے بچوں کی پرورش کس طرح کرنی ہے۔

اس دن بابا کے ہاتھوں زین لالہ کی پٹائی پر اندر ہی اندر میرے دل کو ایک کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔ کس طرح وہ مجھے جلا جلا کر دادا جان سے لاڈ اٹھواتے تھے۔ اس دن کے بعد زین لالہ کبھی دادا کے ساتھ شکار کھیلنے نہیں گئے مگر انہوں نے دوسرے مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں۔ اب چھٹیوں میں وہ دادا جان کے ساتھ زمینوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ اور شام کو واپس آتے تھے اور مجھے اس بات پر بہت خوشی ہوتی تھی۔ کیونکہ اب مما کی توجہ کا مرکز میں تھی مما چاہتی تھیں کہ میں ہر وقت خاموش رہا کروں ان کی طرح، انہیں میرا زین لالہ سے جھگڑنا اچھا نہیں لگتا تھا اس لیے وہ اکثر مجھے ڈانٹ دیتی تھیں۔ لیکن مجھے ان کی یہ ڈانٹ بھی بہت اچھی لگتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دن بابا حویلی آئے ہوئے تھے، ناشتے کی ٹیبل پر میں، مما، زین لالہ اور بابا موجود تھے۔ بابا اخبار پڑھ رہے تھے جب اچانک زین لالہ نے مما سے فرمائش کی کہ وہ پراٹھا کھائیں گے۔ شاید یہ انہوں نے اس لیے کہا تھا کہ ابھی ابھی زلیخا مجھے پراٹھا دے کر گئی تھی ورنہ تو وہ ناشتے میں کبھی پراٹھا نہیں لیتے تھے۔ مما خود ان کے لیے پراٹھا بنانے کے لیے اٹھنے لگی تھیں کہ لالہ نے انہیں روک دیا۔

"رہنے دیں مما! آپ تکلیف نہ کریں۔ یہ پراٹھا موجود تو ہے۔" انہوں نے میری پراٹھے والی پلیٹ اپنی طرف کر لی تھی۔ اسی وقت بابا نے اخبار ہٹایا تھا۔

"پراٹھا واپس رکھو زین! یہ انا کے لیے ہے، مجھے پتا

ہے تم کبھی ناشتے میں پراٹھا نہیں لیتے۔" بابا نے سختی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں بابا! لالہ کو کھانے دیں۔" مجھے زین لالہ کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ترس آیا تھا لیکن پتا نہیں لالہ کو کیا ہوا کہ وہ زور سے کرسی کھسکا کر اٹھ گئے۔

بابا نے زین کو جاتے ہوئے دیکھا اور خود بھی اٹھ گئے۔ مجھے افسوس ہوا' کیا تھا اگر زین لالہ ایسا نہ کرتے۔ دنوں بعد تو وہ حویلی آئے تھے میں بھی ٹیبل سے اٹھنے لگی تو مما نے مجھے روک لیا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔

"مجھے بہت اچھا لگا تمہارا اپنے بھائی کے لیے یہ رویہ۔ بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ تم دنیا کی سب سے اچھی بیٹی بن جاؤ۔" وہ رکی تھیں' میں غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"بیٹا! زندگی میں ہمیشہ ایک جیسے حالات نہیں رہتے۔ زندگی میں بہت کچھ ہمیں نہیں ملتا۔ کچھ ہم سے چھین لیا جاتا ہے اور کچھ ہمیں خود چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں تمہیں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار کرنا چاہتی ہوں' تمہارے بابا آج تو تمہیں دنیا کی ہر چیز دے رہے ہیں لیکن وہ جس ماحول کا حصہ ہیں۔ وہاں وہ زیادہ دیر تک اپنی بات منوا نہیں سکیں گے اور اس سے پہلے کہ وہ دن آئے' میں تمہیں اس کے لیے تیار کرنا چاہتی ہوں میں تمہیں بہت اچھی بیٹی بنانا چاہتی ہوں' دوسروں کے لیے اپنی خوشی کو قربان کرنے والی۔" وہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔

میں نے کچھ دیر تک انتظار کیا پھر اٹھ گئی۔ میں اس وقت مما کی اکثر باتوں کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ پھر بابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔

"گڑیا! تم نے آج بالکل غلط کیا۔ مخالف خواہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اپنا حق کبھی نہیں چھوڑتے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اتنی مضبوط بن جاؤ کہ کوئی تمہارا حق نہ چھین سکے تمہارا سگا بھائی بھی نہیں۔"

بابا یوں سمجھاتے ہوئے مجھے ہمیشہ سے زیادہ اچھے لگتے۔ انہیں میرا کتنا خیال تھا' مجھے ان کی اکثر باتیں اس لمحے پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ لیکن مجھے مما کی ایک ایک بات یاد تھی جو انہوں نے اپنی دس سال کی بیٹی سے کی تھیں۔ ایک ایک بات صرف اس لیے کہ یہ ہی وہ آخری باتیں تھیں جو مما نے مجھ سے کی تھیں۔

پھر ساری زندگی میں اس آواز کے لئے ترستی رہی اور وہ آواز' وہ مشفق چہرہ مجھے کہیں نہیں ملا۔

☼ ☼ ☼

اس دکھ کے موسم میں بابا نے ہم دونوں کو سہارا دیا تھا۔ ہمیں اتنا پیار دیا کہ ہم مما کو بھولنے پر مجبور ہوگئے۔ اب بابا حویلی واپس آگئے تھے وہ زمینوں پر ہوتے تھے۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل رہی تھی۔ جب دادا جان کی وفات نے ہماری زندگی کو بالکل بدل دیا۔ دادا جان کے بعد تایا کی فیملی سے رسمی سا رشتہ بھی ختم ہوگیا اور ہم اسلام آباد شفٹ ہوگئے۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال میں بہت سی چیزیں کھو گئی تھیں۔ دادا جان کی اونچی پگڑی' مما کا سمجھ میں نہ آنے والا انداز' وہ حویلی جس میں' میں نے اور لالہ نے اپنا بچپن' درختوں کے درمیان کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ بابا کا ضدی انداز' لالہ کے لاڈ اٹھوانے والے دن' بہت کچھ ختم ہوگیا تھا۔ اور ایسا بہت کچھ تھا جو بدل گیا تھا لیکن مجھے اس تبدیلی کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔

جب میں میٹرک کے بعد گھر واپس آئی تو تب مجھے اس تبدیلی کا احساس ہوا تھا لالہ کا رویہ اگرچہ کبھی بھی میرے ساتھ بہت اچھا نہیں رہا تھا لیکن ان دنوں مجھے احساس ہوا کہ ہم میں تو بھائی بہن والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ صرف میرے ساتھ ہی نہیں بابا کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ تھا' حتیٰ کہ اگر بابا گھر میں ہوتے تھے تو لالہ نہیں ہوتے تھے اور اگر لالہ گھر میں ہوتے تو بابا غائب ہوتے تھے۔ پتا نہیں ان کے درمیان یہ دیوار کب اٹھی تھی لیکن یہ سب دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ لالہ' بابا کے کاروبار میں ان کا ساتھ دیں۔ بابا ایک دم سے مجھے کمزور لگنے لگے تھے۔ اگرچہ

وہ اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ مما کے جانے کے بعد وہ بہت اکیلے ہوگئے تھے ان کے پاس دوسری شادی کے کئی ایک جواز تھے۔ دولت' جوانی' وجاہت' لیکن انہوں نے تو شاید دوسری شادی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے صرف ہماری خاطر اپنی پوری زندگی کو ویران کر رکھا تھا اور لالہ کو اس کا احساس ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اس صبح' میری آنکھ کچھ نامانوس آوازوں سے کھلی تھی۔ میں نے غور کیا تو وہ بابا اور لالہ کی آوازیں تھیں' وہ بہت اونچی آواز میں بول رہے تھے میں ایک دم سے گھبرا گئی تھی۔ لالہ کہہ رہے تھے۔

"میں امریکہ ضرور جاؤں گا۔ چاہے آپ کو میرا یہ فیصلہ منظور ہو یا نہیں۔"

"لیکن زین! مجھے یہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" بابا کی تھکی تھکی سی آواز آئی تھی' لالہ نے ان کی بات بھی مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

"غلط... آپ کو کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب آپ برطانیہ گئے تھے تو کیا آپ کے بابا کو آپ کی ضرورت نہیں تھی۔" سخت لہجے میں بولتے ہوئے زین لالہ مجھے بہت سفاک لگے تھے۔

"ہاں' میں برطانیہ گیا تھا لیکن اس وقت بابا کے پاس سکندر آغا موجود تھے' ویسے بھی میں وہاں اپنی تعلیم کے سلسلے میں گیا تھا۔" بابا لالہ کی بدتمیزی کے باوجود انہیں وضاحت دے رہے تھے۔ بغیر غصے میں آئے ہوئے۔

"بہرحال مجھے آپ کی ہسٹری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں امریکہ جا رہا ہوں تو بس جا رہا ہوں۔" وہ دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے باہر چلے گئے اور شاید بابا اپنے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے بہت بے چینی ہو رہی تھی۔ "کیا واقعی لالہ امریکہ چلے جائیں گے؟" میں نے خود سے پوچھا تھا۔ بابا اپنے کمرے میں بند ہوگئے تھے' ایسے میں' میں اور ہوا سارا وقت یہی دعا کرتے رہے کہ لالہ کہیں نہ جائیں لیکن ہماری کوئی دعا قبول نہیں ہوئی اور لالہ امریکہ چلے گئے۔

"اپنا خیال رکھنا گڑیا۔ جاتے ہوئے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو میرا دل چاہا کہ میں انہیں روک لوں۔ انہیں کہوں کہ وہ کہیں نہ جائیں' پھر میں اپنا بہت خیال رکھوں گی لیکن میں کہہ نہ سکی اور بن کہے وہ سمجھ نہ سکے۔

ان کے جانے کا جتنا دکھ مجھے تھا۔ شاید اس سے کہیں زیادہ بابا کو تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی بند ہوگئے تھے۔ گھر کی ساری فضا سہمی سہمی سی' وحشت زدہ لگتی تھی میں سارا دن خالی گھر میں چکر لگاتی رہتی تھی۔

ایک دن بابا نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا "میرے کمرے میں ایڈمیشن فارم پڑا ہے۔ اسے بھر دو۔" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لاؤنج سے باہر چلے گئے تھے۔

میں انہیں پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ ان کی چال شکستہ تھی۔ بالوں میں اترتی ہوئی سفیدی دور سے ہی نظر آرہی تھی۔ وہ اتنے تھکے تھکے سے لگ رہے تھے کہ میرا دل بھر آیا۔

"یہ شخص کتنا مضبوط ہوا کرتا تھا' جسے وقت ٹھہر ٹھہر کر دیکھتا تھا۔ جس کے فیصلے دادا جان تک تبدیل نہیں کرسکتے تھے اور آج وہ اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں کتنے کمزور ہوگئے تھے۔ یا اللہ! یہ گردش دوراں انسان کو اتنا کیسے بدل دیتی ہے۔" میں نے بے اختیار پکارا۔

میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی' میں نے بابا سے کہا کہ میں اگلے سال ایڈمیشن لے لوں گی لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے لاہور بھیج دیا۔ ایف ایس سی کے دو سال میرے لیے بہت اہم تھے' مجھے ہر حال میں ڈاکٹر بننا تھا۔ اس لیے دو سال میں نے بہت محنت کی۔ اس عمر میں جب انسان نت نئی دوستیاں کرتا ہے' میری ایک دوست بھی نہیں تھی۔ میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا کسی سے دوستی کرنے کو۔ کسی پر اعتبار کرنے کو۔ مجھے صرف ایک شخص کا خیال آتا تھا اور وہ شخص میرا باپ تھا۔

میں بابا کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کرتی تھی، اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو میں بالکل اکیلی ہی رہ جاتی۔ جب بھی میں بابا کے بارے میں سوچتی تو مجھے احساس ہوتا کہ ان کی جھولی خوشیوں سے بالکل خالی ہے۔ زندگی میں جیسے انہیں کوئی خوشی ملی ہی نہیں تھی۔ میں خدا سے دعا کرتی کہ وہ میرے بابا کی زندگی کو بہت خوبصورت بنا دے۔

ایف ایس سی میں میرے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ اور یہ جہاں میری محنت کا نتیجہ تھا وہاں یہ اس فقرے کا کمال بھی تھا جو ایک بار تایا ابو نے کہا تھا۔ اسی ایک فقرے نے مجھے آگے بڑھنے کی ہمت دی اور میں اپنے خاندان کی سب سے پہلی ڈاکٹر بن کر اپنے بابا کا نام اونچا کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں ان دنوں اسلام آباد آئی ہوئی تھی۔ جب ایک دن عجیب سا واقعہ ہوا۔ ایک شام ہمارے گھر کے گیراج میں ایک گاڑی آکر رکی اور اس سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر جہاں میں حیران ہوئی تھی۔ وہاں بابا بھی حیران تھے، وہ تایا ابو تھے اتنے برسوں بعد انہیں ہمارا خیال آ ہی گیا تھا۔ تایا ابو بہت گرمجوشی سے بابا سے ملے تھے اور بابا بھی اتنے سالوں کے بعد بھائی سے مل کر بہت خوش تھے۔ جانے کتنے دنوں بعد وہ ہنسے تھے۔ میں تو ان سے مل کر اپنے کمرے میں آگئی تھی، لیکن وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔

پتہ نہیں وہ کیا باتیں کر رہے تھے لیکن اس وقت میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی، جب بوا نے مجھے بتایا کہ تایا ابو میرا پروپوزل لے کر آئے ہیں۔ اپنے اس جاہل بیٹے کا پروپوزل جو عورت کو قدموں کی خاک بھی نہیں سمجھتا تھا۔ بابا جس گرمجوشی سے ان سے ملے تھے، بابا پر لاکھ اعتماد کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ یہ پروپوزل قبول کر لیں گے۔ اس دن مجھے مما شدت سے یاد آئیں اور ان کی آخری باتیں بھی۔ ان باتوں نے مجھے اور بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔

"نہیں، میں انکار کر دوں گی۔" میں نے خود کو تسلی دینا چاہی۔

لیکن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا کہ میں بابا کو کبھی کوئی دکھ نہیں دے سکتی تھی، چاہے میں خود دکھی ہو جاتی۔

"مجھے انکار نہیں کرنا چاہیے پہلے ہی بابا گالا کی منہ زوری کے آگے بے بس ہو چکے ہیں۔ ایسے میں میں بھی انہیں دکھ دوں۔ نہیں میں ایسا نہیں کروں گی۔ بابا میری پسند پوچھیں گی تو میں ہاں کر دوں گی۔" یہ فیصلہ کر کے میں بہت مطمئن ہو گئی تھی۔

میں ویسی بیٹی بننا چاہتی تھی جیسی مما مجھے بنانا چاہتی تھیں۔ "بہت اچھی بیٹی۔"

لیکن بابا، میرے اچھے بابا، انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ انہوں نے کسی کو میرا حق چھیننے نہیں دیا۔ نہ میرے سگے بھائی کو اور نہ اپنے سگے بھائی کو۔ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی تایا ابو کو انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے اس بھائی کو خالی ہاتھ لوٹا دیا جو برسوں کے بعد ان سے ملا تھا شاید اس دن انہوں نے ہمیشہ کے لیے انہیں کھو دیا تھا۔ یہ بات سن کر جہاں مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وہیں مجھے ان پر بہت پیار بھی آیا تھا۔

اس دن میں نے عہد کیا تھا کہ اب اگر بابا مجھے کسی اپاہج، نابینا یا کسی بوڑھے شخص سے بھی بیاہ دیں گے تو میں اف تک نہیں کروں گی کیونکہ مجھے یقین تھا۔ وہ میرے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے۔ وہی میرے حق میں بہتر ہو گا۔

☼ ☼ ☼

پھر میں نے بابا سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں، میری بات سن کر بابا ایک دم اداس ہو گئے تھے۔ انہوں نے انگلیوں پر کچھ حساب لگایا تھا۔

"پانچ سال۔" وہ خود سے گویا تھے پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ڈاکٹر بننے کا فیصلہ بدل دو۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

میں حیران تھی، بابا تو خود مجھے بہت زیادہ پڑھانا چاہتے تھے۔ پھر وہ ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔

"لیکن کیوں بابا؟" میں نے پوچھا تھا۔

"اس لیے کہ اب مجھ سے اس ویران گھر میں اکیلا نہیں رہا جاتا۔ پہلے ہی میں بہت دیر تک تمہارے بغیر رہا ہوں، اب مزید نہیں رہ سکتا۔ دیکھو بیٹا! کچھ سالوں میں تمہاری شادی ہو جائے گی۔ اس گھر کے لیے تم پرائی ہو جاؤ گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تب تک تم کہیں نہ جاؤ، بس میرے پاس رہو۔"

وہ بھی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ تنہائی اب انہیں ڈرانے لگی تھی۔ عمر کے اس حصے میں انسان یونہی اکیلا رہنے سے ڈرتا ہے۔

"لیکن اگر تم نہیں چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا، پتا ہے انا، ہم ایک ہاسپٹل بنائیں گے۔ بہت بڑا ہاسپٹل۔" وہ بڑے جوش سے منصوبے بنا رہے تھے اب سے تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی خواہش کا ذکر کر رہے تھے اور اب میری خواہش پر خوش ہو رہے تھے مجھے ان کی اس حالت پر ترس بھی آیا تھا اور ہنسی بھی۔

"نہیں بابا! میں کہیں نہیں جا رہی۔ یہیں آپ کے پاس ہی رہوں گی۔" میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے نے میرے اندر کسی چیز کو بہت دکھ دیا تھا اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

"تمہارا خواب، تمہاری زندگی کا واحد خواب! جس کے سہارے تم اب تک جیتی آ رہی ہو۔ اس کا کیا ہو گا؟" میرے دل نے زور سے دھڑک کر احتجاج کیا تھا۔

کیسا خواب! وہ خواب تو میں بابا کے حوالے سے دیکھتی تھی۔ انہیں خوشیاں دینے کے لیے اگر وہ اس طرح ہی خوش ہیں، تو میرے لیے یہ ہی بہت ہے۔" میں نے اس احتجاج کو دلائل سے رد کر دیا تھا اور اپنی آنکھوں کے گوشوں سے اس پانی کو صاف کیا تھا، جو میرے خواب کی کرچیاں چبھنے سے میری آنکھوں

عمیرہ احمد کا قسط وار
ناول
امربیل
اب کتابی شکل میں شائع
شائع ہو گیا ہے
خوبصورت سرورق، آفسٹ
پیپر، مضبوط جلد، خوبصورت
چھپائی
قیمت ـــ 400/- روپے
ڈاک خرچ ـــ 30/- روپے۔
ملنے کا پتہ:۔
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ 37
اردو بازار کراچی
فون:۔ 2216361

میں پھیل گیا تھا۔ اس پانی کو میں نے ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا تھا۔ بابا کی مسکراہٹ کے لیے۔

☼ ☼ ☼

میں نے بی ایس سی میں وہیں اسلام آباد میں ایڈمیشن لیا تھا۔ میں اور بابا اپنا زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزارتے تھے۔ سارا اس لیے نہیں کہ بابا شام کو آفس سے آتے تھے لالہ کے نہ ہونے سے ان کی مشکلیں بہت بڑھ گئی تھیں انہیں بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ اس دن میں شام کے وقت لان میں بیٹھی تھی کہ ایک گاڑی گیراج میں آکر رکی اس میں سے ایک شخص نکلا اور وہ سیدھا میری طرف آیا تھا۔

"یہ کون ہے اور منہ اٹھا کر کدھر چلا آرہا ہے؟" میں حیران تھی۔ اس نے آتے ہی سلام کیا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"فرمائیے۔ کس سے ملنا ہے۔" مجھے یوں اس کے اندر آنے پر الجھن سی ہو رہی تھی۔

"جی اسفندیار آفندی ابھی تشریف نہیں لائے کیا؟" میرے سوال کے جواب میں وہ خاصی تاخیر سے بولا جیسے کہیں کھو گیا ہو' مجھے وہ اور بھی عجیب لگا تھا۔

"جی نہیں وہ ابھی تشریف نہیں لائے۔" میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"جی میں ان کا بزنس پارٹنر ہوں' زنعل آفندی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ گھر کے لیے نکل رہے ہیں لیکن شاید ابھی تک پہنچے ہی نہیں۔" اس نے خاصا طویل جواب دیا تھا اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ بابا کا بزنس پارٹنر اتنا ینگ۔۔۔۔

"آپ تشریف رکھیے' بابا آتے ہی ہوں گے۔" میں اسے وہیں بٹھا کر اندر آگئی۔

تھوڑی دیر بعد بابا آگئے اور پھر وہ دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ بابا ہمیشہ اپنے بزنس کے معاملات فیکٹری میں چھوڑ کر آتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے آج تک کسی شخص کو اتنی دیر تک گھر میں بٹھائے رکھا تھا۔

شاید تیسرے دن کی بات ہو گی' اس وقت میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس دن مجھے لالہ بہت یاد آرہے تھے انہیں امریکہ گئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے اور ان تین سالوں میں سوائے چند ایک ٹیلی فونز کے انہوں نے ہم سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ یہ رابطہ بھی صرف مجھ تک محدود تھا' بابا سے تو وہ بات ہی نہیں کرتے تھے' میں اس وقت ان ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی شخص میرے بہت قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ شاید اس کی مسلسل گھورتی ہوئی نظروں کا اثر تھا جو اچانک میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ میں نے دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا مشکل سے نام والا۔

پتا نہیں وہ کب سے کھڑا مجھے گھور رہا تھا' میرے متوجہ ہونے پر اس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ اب اس کی نظران ڈھیر سارے پتوں پر ٹکی تھی جو میرے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ سوچتے ہوئے شاید میں ان کو نوچتی رہی تھی۔ مجھے اس شخص پر شدید غصہ آیا تھا۔ وہ بغیر اجازت اندر کیسے آگیا تھا۔ لیکن نہیں اس کی گاڑی گیراج میں کھڑی تھی اور اس نے یقیناً ہارن بھی دیا ہو گا۔ اپنی سوچوں میں مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

"جی تشریف رکھیے۔ بابا آتے ہی ہوں گے۔" میں اس سے پیچھا چھڑا کر اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ جب مجھے اپنے پیچھے اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

"مس لنا! میں آفندی صاحب سے ملنے نہیں آیا۔"

مجھے حیرت ہوئی تھی پھر کس سے ملنے آیا تھا وہ اور اسے میرا نام کس نے بتایا؟ شاید اس نے میری حیرت محسوس کر لی تھی۔

"دراصل آفندی صاحب کو اچانک کراچی جانا پڑ گیا ہے' انہوں نے کہا تھا میں آپ کو اطلاع دے دوں۔" مجھے اور بھی حیرت ہوئی تھی۔

"بابا یوں بغیر اطلاع کے کہیں نہیں جاتے تھے اور اگر جانا بہت ضروری تھا تو وہ مجھے فون کر سکتے تھے۔" وہ میری حیرت دور کرتے ہوئے بولا۔

"دراصل وہ گھر کال کرتے رہے تھے لیکن شاید فون نہیں سکا۔"

مجھے یاد آیا صبح سے فون ڈیڈ پڑا تھا۔ بہرحال وہ شخص اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

"میں آپ کا شکریہ قبول کر سکتا ہوں اگر آپ مجھے ایک کپ چائے پلوا دیں۔" اس نے کمال بے تکلفی سے فرمائش کی۔

پتا نہیں وہ اتنا پھیلتا کیوں جا رہا تھا لیکن بابا کی وجہ سے میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ میں چائے کا کہنے جا رہی تھی کہ جب میں نے اس کی آواز سنی۔

"مجھے اکیلے چائے پینے کی عادت نہیں۔" وہ مزید گویا ہوا۔

"سبحان اللہ! ذرا سی بات کیا کر لی' یہ صاحب تو فری ہو گئے۔" میں اپنا غصہ دباتے ہوئے واپس پلٹی تھی' بوا اور کیدار کے ہوتے ہوئے یوں تو کوئی خوف نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس شخص سے مجھے مسلسل ڈر لگ رہا تھا۔

میں ہمیشہ سے کو ایجوکیشن میں پڑھی تھی لیکن اس دن اس کے سامنے بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میرے ہاتھ لرز رہے تھے اور یہ کیفیت اس شخص کی مسلسل گھورتی اور کچھ کھوجتی ہوئی نظروں کی وجہ سے تھی۔ جب وہ جا رہا تھا تو اس نے رک کر میری طرف دیکھا اور کہا تھا۔

"اسفندیار آفندی تو شاید کل تک واپس آئیں۔ آپ اچھی طرح دروازہ لاک کر کے سوئیے گا اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو کوئی پریشانی ہو تو مجھے فون کیجیے گا۔" اس نے کارڈ نکال کر مجھے دیا۔

پہلے پہل تو مجھے حیرانی ہوئی کہ ایک اجنبی شخص یہ سب کیوں کہہ رہا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے بابا نے اسے یہ ساری ہدایات دی ہوں۔ اس لیے میں نے وہ کارڈ لے لیا تھا اس رات بابا کے بغیر واقعی مجھے بہت ڈر لگا تھا۔

میں زنعل آفندی کی ہدایت کے مطابق سارے دروازے بند کر کے اور سونے سے پہلے لاک چیک کر کے سوئی تھی۔ بوا کو میں نے اپنے کمرے میں ہی روک لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس واقعہ کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد بابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور جو بات انہوں نے کہی' اس نے میرے ہوش ہی اڑا دیے۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے بیٹا۔" انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔

"جی بابا کہیے۔" میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"میں نے تمہارے لیے ایک فیصلہ کیا ہے بیٹا! میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔" وہ میرے تاثرات دیکھنے کو رکے تھے۔

"اگلے جمعے کو زنعل آفندی سے تمہارا نکاح ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" بابا نے ایسے کہا تھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "اس ویک اینڈ پر ہم ہوٹل میں کھانا کھائیں گے' کہو ٹھیک ہے ناں۔"

مجھے تو اپنی سماعتوں پر شک سا ہونے لگا تھا۔

مجھے اس بات پر اعتراض نہیں تھا کہ بابا نے کسی شخص کو میرے لیے چنا تھا' مجھے اعتراض اس بات پر تھا کہ یہ سب بہت جلدی میں ہو رہا تھا۔

"لیکن بابا! میری تعلیم۔۔۔۔" انہوں نے میری بات کاٹ دی تھی۔

"لڑکیوں کے لیے اتنی تعلیم کافی ہوتی ہے۔" ان کے غیر جذباتی لہجے میں کہا ہوا یہ فقرہ مجھے کسی طوفان سے کم نہیں لگا۔

مجھے مما کی بات یاد آئی تھی۔ تو کیا بابا کو وقت اور حالات نے بدل دیا تھا' مجھے ان کا یہ یکسر نیا روپ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ "کیا بابا ایسا کہہ سکتے ہیں؟" میں سوچ رہی تھی۔

"دیکھو گڑیا! میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم دنیا کی ہر ڈگری حاصل کرو بہت زیادہ پڑھو لیکن تمہارے بھائی کے امریکہ چلے جانے سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میرے بعد تمہارا کیا ہو گا۔ اگر میں آج مر جاؤں تو کل تمہیں سہارا دینے والا کون ہو گا؟ ہمیں تمہیں حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور تعلیم تو تم شادی کے بعد بھی حاصل کر سکتی ہو۔" میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے مجھے سمجھا رہے تھے۔

"جہاں تک زہمل کا تعلق ہے۔ اسے میں نے ہر لحاظ سے تمہارے لیے بہترین پایا ہے، تم خود بھی اس سے مل چکی ہو اور وہ بھی تم سے مل چکا ہے اور یہ شادی بھی اسی کی خواہش پر ہو رہی ہے۔ لیکن اگر تمہیں زہمل اچھا نہیں لگا یا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے تو تم کھل کر مجھے بتا سکتی ہو کیونکہ آخری فیصلہ تو تمہارا ہی ہو گا۔" انہوں نے فیصلے کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر رکھ دیا تھا۔

مجھے زہمل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ تایا ابو والے واقعے کے بعد تو میں بابا کے منتخب کیے ہوئے ہر شخص کو قبول کر سکتی تھی۔ یوں بھی بابا نے کہا تھا کہ رخصتی میرے پیپرز کے بعد ہی ہو گی اس لیے ہر طرح سے مطمئن ہو کر میں نے بابا کے انتخاب کو قبول کر لیا تھا۔ مجھے ان کے فیصلے پر یقین تھا۔

زہمل سے میرا نکاح بہت سادگی سے ہوا تھا۔ میں نے اسے اس دن دیکھا بھی نہیں اور یوں میں "نانا اسفند" سے "نانا زہمل" بن گئی اور نام کی اس تبدیلی نے میری پوری زندگی کو ہی تبدیل کر دیا تھا۔ میری سوچوں اور خیالات کو بھی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال گزارے تھے ایک دم سے اپنی بانہیں سمیٹ کر میرے لیے اجنبی بن گیا تھا۔ ان دنوں مجھے اپنی مما بہت یاد آئی تھیں، جس دن میرا نکاح ہوا تھا اس دن تو وہ ہمیشہ سے زیادہ یاد آئیں۔ مجھے ان کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوئی، ساتھ ہی لالہ کے نہ ہونے کا غم بھی مجھے رلا رہا تھا۔

اس دن رات کے دو بجے ان کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے مبارک دے رہے تھے، مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں سب کیسے پتا چلا۔ شاید بوا کے ذریعے پتا چلا ہو بہرحال مجھے دو باتوں کی بہت خوشی ہوئی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھے اور دوسرا یہ کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح بابا کے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

"یہ پہلا کام ہو گا جو اس شخص نے اچھا کیا ہے۔" بالکل اجنبیوں کی طرح بابا کا ذکر کر رہے تھے مگر انہوں نے تو شاید زہمل کی تصویر بھی نہیں دیکھی ہو گی پھر انہیں کیسے پتا چلا کہ وہ میرے لیے اچھا ثابت ہو گا شاید یہ سب بھی وہ بوا سے پوچھتے ہوں گے اور یہ کو تو زہمل بہت پسند آئے تھے۔ مجھے خوشی تھی کہ اس فیصلے میں بابا اور لالہ دونوں کی مرضی شامل تھی۔

ان دنوں میں نے پہلی بار زہمل کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ "وہ کیسا تھا۔" میں اس کا ذہن میں لانے لگی۔

"اس کا قد اتنا لمبا ہے کہ شاید میں اس کے کندھوں تک پہنچتی ہوں گی۔ اس کی مونچھیں بہت خوبصورت ہیں۔ اس کی ڈریسنگ اور اس کی بلیک مرسڈیز بہت شاندار ہے اور اس کی آنکھیں، پتا نہیں اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے؟ وہ گہری ہیں یا نہیں۔ اس کی آنکھیں بار بار مجھے گھور رہی تھیں۔ اور بس۔۔۔ مجھے اس کے بارے میں اتنا ہی پتا تھا۔

اس دن کے بعد وہ صرف ایک دو بار گھر آیا تھا اور بھی بابا سے ملنے۔ بابا سے ملتا اور واپس چلا جاتا۔ ایک بار اس نے فون کیا تو بھی مجھ سے بات کرنے کے بجائے اس نے بابا کو بلانے کے لئے کہا تھا۔ میرا اس کے بارے میں پہلا امپریشن تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ تو اچھا خاصا شریف آدمی تھا مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بابا کی پسند بری نہیں تھی۔

پھر ایک حیرت انگیز تبدیلی یہ آئی کہ مجھے اس کا اس کے فون کا انتظار رہنے لگا تھا، اس کی آواز سننا مجھے اچھا لگنے لگا تھا، پہلی بار میں نے بابا کے علاوہ کسی اور مرد کے بارے میں اتنا سوچا تھا۔ شاید بابا نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا۔ اس دن بیٹھے بیٹھے اچانک انہوں نے زہمل کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔

"دراصل وہ تم سے ملنا چاہ رہا تھا، میں نے اس سے کہا کہ اس کے یہاں آنے کے بجائے میں تمہیں اس کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ اس طرح تم اپنا گھر بھی دیکھ لو گی۔" بابا نے خود ہی سب کچھ طے کر لیا تھا۔ انہیں اتنا بھی آزاد خیال نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"صبح تیار رہنا میں تمہیں آفس جاتے ہوئے چھوڑ دوں گا۔" بابا پروگرام طے کرتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔ میں انہیں روکنا چاہتی تھی۔ میں خود سے زہمل کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی، لیکن بابا جا چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

میری زندگی میں میرا پہلا تجربہ تھا، بطور خاص کسی کے لیے تیار ہونے کا۔ میری نہ تو کوئی سہیلی تھی نہ کوئی بہن جو میری کچھ مدد کرتی۔ میں بہت سادگی سے تیار ہوئی تھی پھر بھی مجھے اپنی تیاری بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ جب بابا اور بوا نے میری تعریف کی تو میری پلکیں جھک گئیں اور پھر سارے رستے جھکی ہی رہیں۔

"کیا ضرورت تھی بابا کو یہ سب کرنے کی اور زہمل کو جب وہ خود بھی تو آ سکتے تھے۔" مجھے چڑ ہونے لگی تھی، خود پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، جب بابا نے مجھے سیاہ لوہے کی گیٹ کے سامنے ۔۔۔ اتارا تو میرا دل چاہا کہ میں واپس پلٹ جاؤں لیکن جب تک بابا نے مجھے اندر داخل نہیں کر دیا وہ وہاں سے ہلے بھی نہیں۔

سامنے سرخ اینٹوں کی لمبی سی روش تھی جس کے دونوں اطراف خوبصورت پھولوں کے گملے ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ وہ ایک خوبصورت گھر تھا، جدید اور قدیم تعمیر و سجاوٹ کے امتزاج سے آراستہ۔۔۔ لکڑی کے بڑے سے دروازے سے مجھے ایک ملازمہ نے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا تھا، میں بہت نروس ہو رہی تھی۔

ڈرائنگ روم بہت سادگی سے سجایا گیا تھا، مجھے ایسے گھر بہت اچھے لگتے ہیں۔ جہاں سامان کی بہتات نہ ہو۔ میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے میں اتنی محو تھی کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب کوئی اندر داخل ہوا اور شاید یہ نگاہوں کی تپش کا اثر تھا کہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

جتنی محویت سے میں ڈرائنگ روم کو دیکھنے میں مصروف تھی اس سے کہیں زیادہ محویت سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل زور سے دھڑکا، ہتھیلیاں ایک دم پسینے سے تر ہو گئیں۔ نظریں جھکیں تو پھر جھکی ہی رہ گئیں، مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں پلکیں اٹھا کر اسے دیکھ سکوں۔ اس کی گمبھیر آواز نے اس فسوں کو توڑا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم مجھ سے ملنے آئی ہو۔ رات کو میرے دل نے خواہش کی تھی کہ صبح سب سے پہلے میں تمہیں دیکھوں۔ لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ میری خواہش اتنی جلدی پوری ہو جائے گی۔" زہمل آگے بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

غصہ، شرمندگی اور حیا سے میری پیشانی جل اٹھی تھی۔ پتا نہیں، بابا نے ایسا کیوں کیا تھا کیونکہ زہمل کے حلیے اور اس کے ہر انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ میری آمد سے آگاہ نہیں تھا۔ میرا وہاں آنا اور ٹھہرنا اس بات پر مہر ثبت کر دینے کے مترادف تھا کہ میں لڑکی ہونے کے باوجود اس کی طرف پہل کرنے آئی تھی لیکن میں غلط سمجھی تھی۔

وہ مذاق کر رہا تھا۔ میں اٹھنے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا تھا۔

"تم غصے میں بھی اچھی لگتی ہو' بیٹھو۔" اس نے زبردستی مجھے بٹھایا "پوری بات سننے سے پہلے کوئی رائے قائم نہیں کرتے' میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یوں بھی میرا خیال تھا کہ اسفندیار آفندی تمہیں شام کے وقت لے کر آئیں گے' اس لیے میں نے ایسا کہا' پھر بھی تمہیں برا لگا تو آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔"

وہ مجھ سے سوری کر رہا تھا' ساتھ ہی اس نے میری غلط فہمی بھی دور کر دی تھی تب میں نے سوچا تھا کہ بابا کا انتخاب برا نہیں ہے۔

اس نے مجھے سارا گھر دکھایا پھر ڈھیر ساری باتیں کیں۔ حالتِ حاضرہ' موسم' اسپورٹس وہ کون سا موضوع تھا جس پر اس نے بات نہ کی ہو۔ ہاں البتہ میرے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ میں چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی ورنہ تو شاید میں وہاں ٹھہر ہی نہ پاتی۔ پھر وہ مجھے گھر چھوڑ گیا۔ میں گاڑی سے اترنے ہی لگی تھی جب اس نے مجھے پکارا تھا۔

"تھینک یو انا!" میں حیران تھی کہ وہ کس بات کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

"تھینکس کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مسلسل دو گھنٹے تک مجھے ٹوکے بغیر میری بور باتیں سننے کا۔" مجھے اس نے ایک بار پھر آواز دی۔

"پلیز ایک منٹ رکو انا! میں ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔" میں رک گئی۔ اس کے انداز پر ہنسی آئی تھی۔ پتا نہیں کون سی بات رہ گئی تھی۔

"کیا...؟"

"وہ یہ کہ تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے جملے پر غور کیے بغیر زور سے سر ہلایا تھا۔ لیکن جب اس کا بلند قہقہہ گونجا تو مجھے احساس ہوا کہ اس نے حالاتِ حاضرہ پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ میری تعریف کی تھی اور اسی پر میں بڑے زور و شور سے سر ہلا رہی تھی۔

خجالت کے گہرے احساس کے ساتھ میں نے سٹپٹا کر گاڑی چھوڑی تھی۔ اور پھر میں نے خود کو آئینے میں ہزار زاویے سے دیکھا تھا۔ کیا میں واقعی خوبصور تھی اور اگر تھی تو یہ بات آج سے پہلے مجھے کیوں پتا تھی۔ شاید اس لیے کہ آج سے پہلے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ میں کس روپ میں اچھی لگتی ہو مجھ پر کون سا رنگ اچھا لگتا ہے۔ یہ سب تو پہلی زہمل نے ہی کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

میرے پیپرز ختم ہوئے تو بابا نے میری رخصتی اعلان کر دیا۔ ایک دم سے میرے شجرِ ناہ کو انہوں میرے لیے ممنوع علاقہ قرار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے بارے میں بالکل نہیں سوچا۔

ان کا تھکا ہوا چہرہ' کنپٹیوں سے جھانکتے ہوئے سفید بال' کمزور وجود انہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لالہ واپس آنے پر تیار نہیں تھے اور ایسے میں میں بھی انہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی بابا مجھے روک لیں۔ وہ کہتے کیوں نہیں کہ "گڑیا نہ جاؤ تمہارے بغیر یہ گھر اداس ہو جائے گا۔" انہوں نے مجھے روکا ہی نہیں۔

وہ اس بات پر کتنے خوش تھے کہ میں اپنے گھر جاؤں گی' میں ان کے لیے بوجھ نہیں تھی پھر بھی میرے جانے پر خوش ہو رہے تھے۔ ہر باپ خود غرض کیوں ہو جاتا ہے اور خود غرض تو شاید ہر بھی ہوتی ہے جو زندگی کے نئے روپ کو پانے کے اپنے پیاروں کو چھوڑ جاتی ہے لیکن میں اتنی خود غر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ کم از کم ایک سال کے لیے رخصتی ٹل سکتی تھی۔ تب تک شاید میں لالہ کو واپس آنے پر — آمادہ کر لیتی لیکن اس رخصتی کو صرف زہمل ٹال سکتا تھا۔

اسی سلسلے میں' میں اس دن اس کے گھر گئی تھی کاش' میں اس کے گھر نہ گئی ہوتی تو میں زہمل کے روپ کو دیکھ نہ پاتی۔ ہمیشہ بہت نرم لہجے میں' سے باتیں کرنے والا وہ شائستہ زبان شخص زہمل ہی

نہ تو میری سماعتیں دھوکا کھا رہی تھیں اور نہ بصارت۔ ہاں وہ زعل ہی تھا جو اس وقت بلند آواز میں اپنے ملازموں پر چیخ رہا تھا۔

"میرے اللہ! یہ زعل ہے، جانوروں کی طرح چیختے ہوئے؟" یوں لگ رہا تھا کہ دیواریں بھی اس کے غصے سے کانپ رہی ہوں جیسے دادا جان کے غصے سے حویلی کی دیواریں لرزا کرتی تھیں۔ پھر زعل نے اپنے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر پڑی ہوئی پلیٹ زور سے زمین پر پٹخی تھی۔ بالکل دادا جان کی طرح اور کرسی کھسکا کر اٹھ گیا، بالکل لالہ کی طرح۔۔۔ اور اسی لمحے شاید اس نے مجھے دیکھا تھا۔

میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ میرا چہرہ تپ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے قدم میرا بوجھ برداشت نہیں کر سکیں گے اور میں وہیں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی لیکن ایسی حالت میں، میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر میں واپس پلٹی تھی۔ پیچھے سے اس نے مجھے کتنی آوازیں دیں مجھے معلوم نہیں، بعد میں اس کا فون بھی آتا رہا لیکن میں نے بات نہیں کی۔

بچپن میں جب دادا جان مجھے ڈانٹا کرتے تھے تو میری یہی حالت ہو جاتی تھی اور آج اتنے برسوں کے بعد مجھے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تو تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو آج بھی اپنے بچپن میں جی رہی تھی۔ اپنے بچپن کی طرح کمزور تھی، کسی کی سخت بات برداشت نہیں کر سکتی تھی اور کسی کے غصے کو جھیلنا اب بھی میرے لیے ناممکن تھا اور کیا ایک ایسے شخص کے ساتھ میں اپنی پوری زندگی گزار سکتی تھی؟ شاید نہیں۔۔۔ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ نہ اپنے لیے، نہ بابا کے لیے۔

کبھی اکیلے بیٹھتی تو مجھے مما یاد آتیں، زندگی میں مجھے ان کی ضرورت اس سے پہلے کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے وہ آ جائیں، مجھے اپنی گود میں چھپا لیں لیکن وہ ایک بار بھی نہیں آئیں، نہ ہی لالہ آئے اور نہ میں انہیں بلا سکی۔ زعل تو ان ہی لوگوں کی طرح تھا جن سے میں آج تک ڈرتی اور بابا آج تک لڑتے آئے تھے۔ ان سے غلطی ہو گئی تھی، شاید وہ بھی زعل کے اس روپ کو نہیں جانتے تھے، میری ہی طرح وہ بھی بے خبر تھے اور میں انہیں کچھ نہ بتا سکی۔

☼ ☼ ☼

پھر وہ وقت آ گیا جب میرا اپنا گھر ہمیشہ کے لیے میرے لیے اجنبی ہو گیا اور ایک گہرا اور بے نام دکھ میری رگوں تک میں اتر آیا۔

"ہجرت کا دکھ"

محبتوں جیسا، چاہت سا دکھ ہے
سکون کی طرح، راحت سا دکھ ہے
یہ دکھ ہجرت کا، مسافرت کا دکھ ہے
مہاجر پرندوں کا، یہ بدلتی رُت کا دکھ ہے
فصیل جاں میں ٹھہرا ہوا سا، رکتا سا دکھ ہے
اجنبی دیسوں کے لیے اذنِ سفر ہو
کہ اجنبی چہروں کا ساتھ
یہ ہر شہر کا دکھ ہے
یہ ہر گھر کا دکھ ہے
بہار کے موسم میں رونے کا
خزاں میں ہنسنے کا دکھ ہے
یہ ہر تتلی کا دکھ ہے
یہ ہر بیٹی کا دکھ ہے۔۔۔

اس دکھ کو دونوں ہتھیلیوں میں سنبھالے میں اپنے شفیق باپ کے حزیں لمس کے سائے میں اس گھر کے مانوس سناٹوں کو چھوڑ کر اجنبی قہقہوں کی گود میں رہنے چلی آئی۔ رخصت کے اس کربناک موسم میں مجھے اپنی ماں کی وہ باتیں بہت یاد آئیں جو انہوں نے دس سال پہلے، دس سال کی بیٹی سے کہی تھیں اور ان باتوں نے مجھے اور بھی ڈرا دیا، سہما دیا۔ وہاں کوئی ایسا نہیں تھا جسے میں اپنا دکھ بتا سکتی، ایک اجنبی شخص تھا جس کے ہاتھ میں میرے باپ نے میرا ہاتھ پکڑا دیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی جانے بغیر مجھے اس گھر کی تنہائی سے

خوف آ رہا تھا، جہاں میں چلی آئی تھی۔

اگر زعل میری کسی بات پر غصے میں آ جائے تو میں کیا کروں گی؟ میرا ڈر بڑھتا جا رہا تھا۔

جب زعل کمرے میں داخل ہوا تو اس کے قدموں کی بلند ہوتی ہوئی ہر چاپ نے میرے اندر سناٹا بھر دیا۔ میری دھڑکن میرے قابو سے باہر تھی اور یہ کسی خوبصورت احساس کے زیر اثر نہیں تھا، یہ تو اس خوف کی وجہ سے تھا جو میرے چاروں طرف بے ہنگم رقص کر رہا تھا۔ میرے حواس دھیرے دھیرے میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے، اندھیرا مجھے گھیر رہا تھا اور جب زعل نے میرا ہاتھ پکڑا تو اس خوف نے پوری طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو زعل میرے سرہانے بیٹھا تھا، میرے ہوش میں آنے پر وہ اٹھ گیا اور اس رات، نئی زندگی کی پہلی رات اس نے مجھ سے چند باتیں کیں۔

"میں نہیں جانتا کہ دل کے راستے پر کون سا موڑ میں نے غلط کاٹا ہے لیکن رستہ بدل چکا ہے۔ مجھے میری منزل تک لے جانے والا رستہ گم ہو گیا ہے۔ میری منزل تم ہو انا! تم تک پہنچنے والا رستہ میں ضرور ڈھونڈوں گا۔" وہ نظریں میرے چہرے پر گاڑے ٹھہرے ٹھہرے اور تھکے تھکے سے لہجے میں بول رہا تھا۔

"میں نے ہمیشہ اپنی بیوی کے بارے میں ایک ہی بات سوچی ہے کہ سب سے پہلے وہ میری اچھی دوست ہو، جس کو مجھ سے کچھ کہنے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہ ہو، جسے مجھے کچھ کہنے سے پہلے سوچنا نہ پڑے۔ پتہ نہیں کیوں تم میری دوست نہیں بن سکیں۔ کیوں نہیں بن سکیں، اس کی وجہ میں نہیں پوچھوں گا لیکن میں تمہیں اپنی سب سے اچھی دوست بنانا چاہتا ہوں اور جب تک تم میری دوست نہیں بن جاتیں میرے لیے تم "انا اسفند" ہی رہو گی۔"

وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو میں نے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں خود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس دن کے بعد میں نے ایک بار بھی زعل کو غصے میں نہیں دیکھا تھا لیکن پتا نہیں یہ کیسا خوف تھا کہ جب بھی میں پچھلی باتوں کو بھول کر اس کی طرف دیکھتی مجھے لگتا کہ وہ ابھی بدل جائے گا۔ جب بھی میں اس سے بات کرنے کے لیے اسے مخاطب کرنا چاہتی، مجھے لگتا وہ ابھی مجھے ڈانٹ دے گا۔ حتیٰ کہ میرا رویہ اس کے ساتھ بالکل ایسا ہو گیا تھا جیسا کسی شاگرد کا اپنے سخت گیر استاد سے ہوتا ہے۔

اس دن میں نے پہلی بار کھانا بنایا تھا، مجھے فکر ہو رہی تھی کہ پتا نہیں وہ زعل کو اچھا لگے گا یا نہیں۔ کھانے کی ٹیبل پر جب اس نے پہلا لقمہ لیا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "جانے اب وہ کیا کہے گا؟" میں نے سوچا۔ پہلا لقمہ لے کر اس نے ہاتھ روک دیے تھے۔

"یہ کھانا کس نے بنایا ہے؟" سنجیدہ اور بے تاثر لہجے میں اس نے پوچھا۔

"شاید کھانا زیادہ ہی برا بنا تھا۔ پتا نہیں اب وہ میرا کیا حشر کرے گا۔" مجھے لگا کہ میں خوف سے مر ہی جاؤں گی۔ جیسا سلوک وہ اس دن اپنے ملازموں کے ساتھ کر رہا تھا، میں بھی ویسے ہی سلوک کی منتظر تھی۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی تو میں نے اپنی ساری قوتیں جمع کر کے کہا تھا۔

"کھانا اس نے نہیں میں نے بنایا ہے۔"

"یہ تم نے بنایا ہے؟" وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"پہلی بار میں نے کھانا بنایا ہے، کیا ہے اگر اچھا نہیں بنا۔" میں خود کو تسلی دے رہی تھی۔

"دراصل میں نے پہلی بار کھانا بنایا ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا برا بنے گا" "آئی ایم سوری۔" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

لیکن جواب میں میں نے اسے مدھم سا مسکراتے ہوئے دیکھا۔ "تمہیں کس نے کہا کہ یہ برا بنا ہے، پہلے

urdunovelszone.com

نوالے کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تم نے بنایا ہو گا کیونکہ کلثوم کو تو اتنا اچھا پکانا ہی نہیں آتا۔"

وہ کیا کہہ رہا تھا؟ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی لیکن ویسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اتنے گہرے خوف سے ایکدم نکل کر نہ تو میں ہنس پا رہی تھی اور نہ رو سکی تھی۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ پہلی ہی بار میں اتنا اچھا کھانا پکا سکتی ہوں۔

"سنا ہے نئی نویلی دلہن جب پہلی بار کھانا بناتی ہے تو اسے انعام دیا جاتا ہے' کوئی رسم ہے شاید۔ تم بتاؤ' تم کیا لوگی مجھ سے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

اس لمحے مجھے صرف یہ ہی یاد آیا کہ مجھے بابا سے ملے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے' میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے بابا کے گھر چھوڑ دے اور جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو پتا نہیں کیوں اس کے مسکراتے ہوئے لبوں کو ساکت ہوتے اور اس کی پیشانی پر لمحہ بھر کے لیے شکنیں ابھرتی ہوئی دیکھی تھیں۔ بہرحال بابا سے ملنے کی خوشی میں' میں جلدی جلدی کھانا کھانے لگی تھی۔

میں نے پہلا لقمہ لیا۔ "اف' اتنا نمک۔" مجھ سے نہ تو وہ اگلا جا رہا تھا اور نہ نگلا۔ میں نے حیرت سے زعمل کی طرف دیکھا تھا۔

وہ کتنے مزے سے کھا رہا تھا۔ میرا دل چاہا میں اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دوں کہ وہ یہ کھانا نہ کھائے لیکن اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا جس سے مجھے لگتا کہ اسے کھانا برا لگ رہا تھا۔ میں ہاتھ روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی' جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

"چلیں؟" اس نے پوچھا تھا۔ مجھے ڈھیر ساری شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ زعمل نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے مجھے ڈانٹا کیوں نہیں' اپنی اسی شرمندگی سے نکلنے کے لیے میں جلدی سے اٹھ گئی تھی۔

اس دن اپنی بیس سالہ زندگی میں پہلی بار میں نے بابا کا ایک انوکھا روپ دیکھا' مکمل طور پر ایک باپ کا روپ — مما کی موت' دادا کی موت' تایا ابو اور لالہ کی جدائی۔ ان میں سے کوئی دکھ ایسا نہیں تھا جس نے ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوں اور میں نے' میری جدائی نے ان کی آنکھوں کو نم کر رکھا تھا" آواز رندھ گئی تھی۔

بابا تو اس دن بھی نہیں روئے تھے جب میں اس گھر سے رخصت ہوئی تھی اور آج مجھے پیار کرتے ہوئے کتنے کمزور لگ رہے تھے' مجھے بھی ڈھیر سارا رونا آ گیا تھا۔

"کیا ہوتا ہے یہ بیٹی سے جدائی کا دکھ' جو انسان کی مضبوط شخصیت کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے' کمزور کر دیتا ہے اور کیا چیز بنائی ہے بنانے والے نے یہ بیٹی بھی' زندگی بھر رلاتی ہی رہتی ہے' کبھی آنسو بہتے ہیں اور کبھی بہے بغیر ہی انسان روتا رہتا ہے۔"

اس دن بابا کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ان کی دوائیوں کا شیڈول بناتے ہوئے غرض کہ بات بات پر مجھے بابا کی تنہائی کا احساس ہوا۔ کیا ہوتا اگر لالہ بابا کی خاطر رک جاتے تو آج یہ گھر بھی آباد ہوتا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن زعمل شام کے وقت آیا تھا۔ پتا نہیں اس دن ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ زعمل کے انداز میں وہ گرمجوشی مفقود تھی جس کے ساتھ وہ پہلے بابا سے ملتا تھا۔ وہ مجھے لینے آیا تھا' جب میں آ کر گاڑی میں بیٹھی تو اس نے فوراً" گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی میں بالکل خاموشی تھی۔

میری توجہ گاڑی سے باہر انجان رستوں پر تھی' یقیناً" زعمل کا رخ گھر کی طرف نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ مجھے کہاں لے کر جا رہا تھا' میں اس سے پوچھنا تو چاہتی تھی لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پوری کوشش کر کے میں نے پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے کر جا رہا تھا۔

"فکر نہ کرو' کسی غلط جگہ لے کر نہیں جا رہا' آج میں تمہیں اپنی پسندیدہ جگہ دکھاؤں گا۔" وہ دھیمی آواز میں

بولا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سی جگہ ہے۔ میرا خیال تھا وہ کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ ہو گا لیکن اب گاڑی شہر کی حدود سے باہر نکلی تو میرا خیال غلط ثابت ہوا' وہ کہیں اور جا رہا تھا۔ اب گاڑی پکی سڑک سے اتر کر کچے رستے پر آ گئی تھی' کل کی بارش نے مٹی کو دبا رکھا تھا ورنہ دھول میں کچھ نظر ہی نہ آتا۔

بہت خوبصورت مضافات نظر آ رہے تھے۔ خوبصورت کھیتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ' گندم کی نوخیز بالیاں ہوا کی شوخیوں سے لہرا رہی تھیں' شام کا رنگ دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہی شیشہ نیچے کیا۔ ٹھنڈی ہوا کے ایک نرم اور تیز جھونکے نے میرے چہرے کو نرمی سے چھو لیا۔ کھیت میں جھومتے ہوئے سبز سبز پودوں کی شاخیں گاڑی کے اتنے قریب تھیں کہ میں ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو سکتی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان سبز پتوں کی نرمی کو اپنے ہاتھ پر محسوس کیا تھا۔ سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو مجھے اپنے ساتھ بہت پیچھے لے جا رہی تھی۔

"کتنے برس بیت گئے؟" میں نے انگلیوں پر گننا چاہا تھا' جب دادا جان سے چھپ کر چوکیدار کے بچوں کے ساتھ پہلی بار میں نے ان کھیتوں کی نرم بھربھری مٹی کو اپنے پیروں تلے روندا تھا۔"

جب حویلی کے باہر کی دنیا شاید میں نے پہلی بار دیکھی تھی اور جسے دیکھنے کے لیے مجھے کالے شیشوں والی گاڑی کا سہارا نہیں لینا پڑا تھا۔ جب اسی تازہ ہوا میں' میں نے دل کھول کر گہرے گہرے سانس لیے تھے۔

اور پھر کیا ہوا تھا؟ پھر دادا ابو نے مجھے دیکھ لیا تھا اور پھر میرے اس طرح باہر جانے پر انہوں نے مجھے کتنا ڈانٹا تھا۔ مجھے وہ ڈانٹ اب بھی یاد ہے۔ کئی سالوں کی گرد نے بھی ان باتوں کو گم نہیں ہونے دیا تھا۔

اس وقت میرے ننھے سے دل نے دکھ کی شدت کو پہلی بار محسوس کیا تھا اور پھر اس دن کے بعد میں نے یہ سب دوبارہ اتنی آزادی سے نہیں دیکھا اور آج ایک بار پھر میں وہ سب دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب کوئی خواب تو نہیں؟" میں نے سوچا اور ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا شیشہ بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس بار میرے اس خواب کو زعمل آفندی توڑے۔

"کیا ہوا شیشہ کیوں بند کر دیا؟" شاید وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"مٹی اندر آ رہی تھی۔" میں نے احمقانہ سا جواب دیا تھا۔ اس بات کا مجھے خود بھی اندازہ تھا لیکن اس وقت مجھے کوئی اور جواب سوجھا ہی نہیں تھا۔

زعمل نے میرے سامنے سے ہاتھ بڑھایا اور شیشہ پھر کھول دیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اسے دادا جان کی طرح یہ سب برا نہیں لگا تھا۔

"جو چیز آپ کے دل کو اچھی لگتی ہو' اسے کسی کی خاطر نہیں چھوڑتے۔" اس کی بھاری گمبیر آواز گاڑی کے سناٹے میں ابھری تھی۔

"لوگوں کو ایک ہی زاویے سے دیکھنا چھوڑ دو انا زعمل! اعتبار کرنا سیکھو' یقین کرو جہاں تمہاری آنکھوں میں کسی خواہش کا عکس جھلکتا ہے' اسے پورا کرنا میرا فرض بن جاتا ہے۔" وہ مجھے اپنا یقین دلا رہا تھا۔

وہ اس لمحے مجھے بہت عجیب انسان لگا۔ جیسا میں نے اسے پہلی ملاقات میں پایا تھا' ویسا ہی۔ دادا جان اور تایا ابو جیسا زعمل کہیں نظر نہیں آ رہا تھا' اس کے چہرے سے دادا ابو اور تایا جان کے چہرے اتر رہے تھے۔ وہ بہت مختلف لگ رہا تھا' بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس بات کا علم مجھے خود بھی نہیں تھا' مجھے تو اس وقت ہوش آیا جب وہ کہہ رہا تھا۔

"شاید یہ تمہارے ساتھ کا اثر ہو ورنہ آج سے پہلے میں قطعی اتنا خوبصورت نہیں تھا کہ کوئی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہے۔" وہ شوخ لہجے میں بولا۔

مجھے بہت شرم آئی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنا رخ موڑ کر باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے گاڑی روک دی اور دوسری طرف آ کر

دروازہ کھولا تھا۔ تب میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا' ہر طرف سبز سبز قالین بچھے ہوئے تھے' سبز پودوں کے قالین اور ان کے درمیان سفید رنگ کی ایک خوبصورت سی عمارت تھی اور دور مغرب میں غروب ہوتا ہوا سرخ سورج' گاؤں کا سا ماحول' فضا میں گونجتی چکیوں کی آوازیں' یہ سب کتنا دلکش تھا شاید بیان کرنے کی حد سے بھی زیادہ۔ واقعی اس کی پسند بہت اچھی تھی۔

"یہاں آؤ۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ ایک درخت کے پاس لے آیا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑنا میرا دل دھڑکا گیا تھا۔ مجھے اس سے جو خوف محسوس ہوا کرتا تھا وہ ختم ہو رہا تھا' نہ تو میرے ہاتھ کانپے تھے اور نہ اس سے بات کرنے میں مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ دیکھو۔" وہ دور مغرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شام کے رنگوں میں رخصت ہوتے سورج کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ منظر بہت خوبصورت تھا۔ میں اور وہ... ہم دونوں ٹکٹکی باندھ کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

جب اچانک وہ پلٹا تھا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا' اب میری پلکیں جھکنے لگیں تو وہ بولا۔

"پلیز! اپلکیں نہ جھکاؤ' ان ہی آنکھوں میں میں نے شام کے رنگ دیکھے ہیں' غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھا ہے اور اب ان ہی آنکھوں سے میری صبح طلوع ہوگی۔ مجھے اس صبح کو ڈھونڈنے دو۔" وہ عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ ایسے ہی کھڑا رہا پھر جیسے یک دم ہوش میں آگیا۔

"آئی ایم سوری' بس یہاں آکر مجھے کچھ ہو جاتا ہے' مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ میں کون ہوں' میں تو جیسے اپنے آپ سے ہی نفی ہو جاتا ہوں۔" وہ شرمندہ شرمندہ سا بول رہا تھا' میں نے بات کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ آپ کی پسندیدہ جگہ ہے؟" میں نے اپنی سوچ کی تائید چاہی تھی۔

"نہیں' پہلے تھی۔" وہ بولا تو مجھے اس کی بات پر حیرانی ہوئی۔

"اب نہیں ہے کیا؟" میں نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" وہ ذرا سا رکا۔ "اب تو پسندیدہ ترین ہو گئی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

اس کی بات کا مطلب سمجھ میں آیا تو میں نے اپنا رخ پھیر لیا۔

اس دن اندھیرا ہونے تک ہم ان پگڈنڈیوں پر گھومتے رہے' رات کے ابتدائی رنگوں کو جھلکتے ہوئے دیکھتے رہے اور دیر تک بے مقصد باتیں کرتے رہے۔ میں جیسے اس کی معمول بن گئی تھی' اس سے محسوس ہونے والا سارا خوف کہیں کھو چکا تھا' اب میں آزاد تھی' اس خوف سے بالکل آزاد۔ وہ دن ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔

☼ ☼ ☼

اس صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی' سورج کی تپش کھڑکیوں تک اتر آئی تھی لیکن دیر سے جاگنے پر پیدا ہونے والی میری ساری سستی اس وقت ختم ہو گئی جب میں نے اپنے سرہانے سرخ گلابوں کا ایک خوبصورت سا بوکے دیکھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا تھا کہ آج میری سالگرہ تھی۔

یہ پھول بھی یقیناً" بابا نے بھیجے تھے کیونکہ ان کا وش کرنے کا انداز ہمیشہ سے یہی تھا۔

میں نے فوراً" بابا کو فون کیا لیکن دوسری طرف سے مجھے پتا چلا کہ یہ پھول بابا نے نہیں بھیجے تھے' میرے لیے یہ کسی قدر حیرانی والی بات تھی' تو پھر اور کون ہو سکتا تھا؟

جب میں کمرے سے باہر آئی تو میرا خیال تھا کہ زمل آفس جا چکا ہو گا لیکن میں نے اسے لاؤنج میں سادہ سے حلیے میں بیٹھے ہوئے دیکھا' مجھے دیکھتے ہی اس نے صبح بخیر کہا اور پھر اس نے مجھے وش بھی کیا۔

"آپ کو معلوم تھا کہ آج میری سالگرہ ہے؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیوں' کیا مجھے پتا نہیں ہو سکتا۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"وہ پھول آپ نے رکھے تھے؟" میں نے اگلا سوال کیا تھا۔

"کیوں' تمہیں اچھے نہیں لگے؟" دوسری مرتبہ بھی میرے سوال کا جواب اس نے سوال سے دیا تھا۔

"نہیں' وہ تو بہت اچھے ہیں لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ آج میری سالگرہ ہے؟" میں نے پھر سے وہی سوال کیا وہ ہنس دیا تھا۔

"جو لوگ آپ کے قریب ہوں' ان کے بارے میں خود بخود سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔" اس نے گول مول سا جواب دے کر واضح طور پر مجھے ٹالا تھا لیکن یہ ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے اسے بابا نے بتایا ہو۔ میں ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔

وہ چینل پر چینل بدل رہا تھا پھر جیسے اس مشغلے سے بھی اکتا گیا' اس نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔

"کتنا بور ہے یہ سب' تم فارغ وقت میں کیا کرتی رہتی ہو؟" اس نے پھر مجھے مخاطب کیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں' کبھی ٹی وی دیکھ لیتی ہوں' کبھی کوئی میگزین پڑھ لیتی ہوں۔" میں نے اسے اپنی مصروفیات کے بارے میں بتایا۔

"اور اگر بور ہو جاؤ تو پھر کیا کرتی ہو؟" وہ کرید رہا تھا۔

"پھر بھی یہ ہی کرتی ہوں۔" میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"میں نے تو سوچا تھا آج تمہاری سالگرہ ہے تو سارا دن گھر پر گزارتا ہوں لیکن اب سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کروں' کہیں باہر چلیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اس نے صرف میری وجہ سے چھٹی کر لی تھی۔

"اتنی گرمی میں باہر جانے کو تو دل نہیں کر رہا۔" پھر وہ خود ہی بولا تھا۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں' گھر میں ہی کوئی گیم کھیل لیتے ہیں۔"

وہ ان بچوں کی طرح منصوبے بنا رہا تھا جنہیں سمجھ نہ آرہا ہو کہ وہ اپنی گرمیوں کی چھٹیاں کس طرح گزاریں' مجھے ہنسی آرہی تھی۔

"کارڈز کھیلیں؟"

"لیکن مجھے تو کارڈز کھیلنے نہیں آتے۔" میں نے اپنی مشکل بتائی۔

"اٹس اوکے' میں سکھا دوں گا۔" اس نے میری مشکل آسان کی اور پھر مجھے ایک سادہ سا گیم سکھایا تھا جس کو سیکھتے ہوئے بھی مجھے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ بمشکل مجھے تھوڑا بہت کھیلنا آیا تھا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی۔

اس وقت بھی جب میں نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پانچ نمبر کے سارے کارڈز اٹھا لیے تو وہ ایک دم سے حیران ہو گیا۔

"یہ کیا کیا؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا کیا ہے؟ میرے تھے' میں نے اٹھا لیے۔" میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ غلط کیا ہوا ہے اور میری بات پر وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔ بمشکل اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔

"کیوں اٹھائے ہیں تم نے یہ کارڈز' ذرا پھر سے بتانا؟" بمشکل ہنسی ضبط کر کے اس نے پوچھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس طرح کیوں ہنس رہا ہے۔

"کیا ہوا ہے؟" میں نے اپنی حیرت کو لفظ دیے۔

اب کی بار وہ خاموش ہو گیا تھا جبکہ آنکھیں ابھی بھی مسکرا رہی تھیں۔

"ایک دم سے سارے کارڈز نہیں اٹھاتے' ایک ایک کر کے اٹھاتے ہیں۔" بالآخر اس نے مجھے میری غلطی بتا دی تھی۔

خیر اس دن بار بار غلطیاں کر کے مجھے کارڈز کھیلنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو گئی تھی اور آخر میں' میں نے اسے ایک بار ہرا بھی دیا۔ اب یہ پتا نہیں کہ وہ جان بوجھ کر ہار گیا تھا یا مجھے ہی کھیلنا آگیا تھا لیکن اس کی شرط کے مطابق ہمارے درمیان دھیرے دھیرے وہی دوستی ہو رہی تھی جو میرے اور اس کے... ہم دونوں کے لیے ضروری تھی۔

اس کا رویہ میرے ساتھ بالکل نارمل ہوتا تھا لیکن

اکثر بات ہی بات میں وہ کوئی ایسی بات کر جاتا جس سے لگتا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے لیکن ابھی تک مجھے اس کا رویہ سمجھ نہیں آیا تھا۔ میں اسے صرف اپنا دوست ہی مان سکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چھٹی کا دن تھا اور میرے سر پر صفائی کا جنون سوار تھا۔ ملازمہ کو ہٹا کر میں نے خود کچن صاف کرنا شروع کیا تھا۔ کام کرتے کرتے اچانک بے خیالی میں مجھ سے کیبنٹ کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ آدھا حصہ تو بالکل کرچی کرچی ہو گیا تھا اور باقی آدھا رہ گیا تھا۔ میں اسے کھینچ کر باہر نکالنا ہی چاہتی تھی کہ زہمل آ گیا۔

سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔ "رکو، میں نکال دیتا ہوں۔" اس نے مجھے روکا اور خود آگے بڑھ کر شیشے کو پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچا اسے نکالنے کی کوشش میں اچانک شیشے کا ٹوٹا ہوا حصہ اس کے ہاتھ کو چیرتا چلا گیا۔ زہمل کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے تھے، ہونٹ بھنچ گئے تھے اور اس نے فوراً اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا، بالکل اچانک اس کے ہاتھ سے نکلتا ہوا سرخ سرخ خون میرے اوسان خطا کر گیا تھا۔

اس کی تکلیف کا احساس کرتے ہوئے مجھے بے اختیار رونا آ گیا تھا۔ خون بھی تو اتنا زیادہ بہہ رہا تھا، میرے ہاتھ زور زور سے کانپ رہے تھے اور مجھے خود پر اختیار نہ رہا تھا۔ خون تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا، میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑ کر دیکھا۔ شاید شیشہ کافی اندر تک گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوپٹہ باندھا تو وہ بھی سرخ ہو گیا۔ اگر مجھے اتنی چوٹ لگی ہوتی تو میں تو زور زور سے چیختی لیکن شاید زہمل مرد ہونے کی وجہ سے ضبط کر رہا تھا۔

"درد زیادہ ہو رہا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا مجھے لگا وہ مسکرا رہا تھا اور میرے دیکھنے پر اس نے زبردستی اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"اٹس اوکے، معمولی سا زخم ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کے جواب نے مجھے اور بھی حیران کیا تھا۔

"یہ معمولی سا زخم ہے؟ اتنا تو خون بہہ رہا ہے۔" مجھے اور بھی دکھ ہوا، ساتھ ہی افسوس بھی کہ یہ میری وجہ سے ہوا تھا۔

ہاتھ زخمی ہو جانے سے زہمل کو کافی مشکل ہوتی تھی۔ کھانے میں بھی اسے ایسی چیزیں کھانا پڑتی تھیں جنہیں بائیں ہاتھ سے آسانی سے کھایا جا سکتا ہو اور اس پر وہ زبردست احتجاج کرتا کہ میں نے اسے بالکل بیکار ہی بنا دیا۔ آفس جانے کے لیے بھی اسے ڈرائیور کی مدد لینی پڑتی، وہ خود گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتا تھا، اس کے کئی کام خود بخود میری ذمہ داری بن گئے تھے اور میں اپنی ذمہ داری اچھی طرح نبھا رہی تھی۔

اس دن وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اچانک اس نے ایک عجیب سی فرمائش کی۔

"انا! مجھ سے میرے بال نہیں بن رہے، پلیز ذرا میری ہیلپ کرو۔" میں نے مڑ کر دیکھا اس کے چہرے پر بے چارگی تھی۔ کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے اس کے اڑھائی فٹ لمبے بال ہوں جو اس سے سنبھل نہ رہے ہوں۔ مجھے اس کی اس بے چارگی پر شک سا ہوا تھا۔

"روز تو آپ الٹے ہاتھ سے بناتے ہیں، آج بھی بنا لیں۔" میں نے انکار کر دیا تھا۔

"ہاں، روز الٹے ہاتھ سے بال بناتا ہوں اور سارے آفس میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہوتی ہیں کہ آج باس بیوی سے پٹ کر آیا ہے۔" اس نے ایسے جلے ہوئے انداز میں کہا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔

"کہنے والوں کو یہ پتا نہیں کہ باس کا ہاتھ زخمی ہے؟" میں نے تفتیشی انداز اپنایا تھا۔

"سیدھی طرح کہو نا کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو۔" مجھے اس کے انداز پر اپنی عزت کا خیال آیا تھا۔

"جی نہیں، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" میں نے صاف انکار کیا تھا۔

"رئیلی؟" وہ شک سے بھرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"اگر مجھ سے ڈرتی نہیں ہو تو جب میں نے

تمہارے ساتھ چائے پینے کی خواہش کی تھی تو تم جھجکی کیوں تھیں اور تم نے تو اپنا ہاتھ بھی چلا لیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم مجھ سے خوفزدہ تھیں۔" وہ مجھے شادی سے پہلے کی ملاقات یاد کروا رہا تھا۔

"اس دن میں نروس ضرور تھی لیکن اس کی وجہ آپ کی گھورتی ہوئی نظریں تھیں۔ آپ مسلسل مجھے گھور رہے تھے' اس وجہ سے میں ڈر گئی تھی۔" میں نے اعتراف کے ساتھ ساتھ اسے اس کا رویہ بھی یاد دلایا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ اس دن وہ مجھے اس طرح گھور کیوں رہا تھا' جبکہ اس کے بعد اس نے مجھے پھر کبھی اس طرح نہیں دیکھا تھا۔

"ایکچوئلی انا! اس دن مجھے تم بہت عجیب سی لگی تھیں' تمہارا رویہ مجھے کچھ غیر فطری لگا تھا' تم اتنے گہرے خیالات میں گم تھیں کہ تمہیں شاید میری آمد کا بھی پتا نہیں چلا تھا' مجھے تجسس ہو رہا تھا تمہارے بارے میں جاننے کا' اسی وجہ سے میں غور سے تمہیں دیکھ رہا تھا لیکن تم اس دن سوچ کیا رہی تھیں کہ تمہیں میری آمد کا پتا ہی نہیں چلا؟" اس نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔

"اس دن میں اپنے لالہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" میں نے اسے اصل بات بتا دی تھی۔ اگر گزشتہ کچھ دنوں میں میرے اور اس کے درمیان اتنی دوستی نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں اسے اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکتی۔

"تمہارے لالہ تو شاید امریکا میں ہوتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی' وہ شادی میں نہیں آئے تھے۔ ایکچوئلی! وہ بابا سے ناراض ہیں۔" میں اس سے چھپا نہیں سکی تھی۔

"کیوں' تم تو اپنے بابا کی بہت تعریف کرتی ہو پھر وہ ان سے کیوں ناراض ہیں؟" وہ کھوجتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پتا نہیں۔ لالہ کو بابا کی کیا بات اچھی نہیں لگتی' پتا نہیں انہیں کیا مس انڈر اسٹینڈنگ ہے ورنہ بابا تو لالہ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔" میں نے یقین سے کہا۔

"اور تم اپنے بابا سے کتنا پیار کرتی ہو؟" یہ سوال کسی قدر غیر متوقع تھا۔

"شاید اتنا' جتنا آج تک کسی بیٹی نے اپنے باپ سے نہیں کیا ہوگا۔" "اور وہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں؟" اس کے جواب کے لیے تو مجھے کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"اتنا جتنا آج تک کسی باپ نے اپنی بیٹی سے نہیں کیا ہوگا۔" میں نے اس کے کی طرف دیکھا' وہ کسی سوچ میں الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

"اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ تمہارے بابا نے زندگی کے کسی مقام پر تمہیں دھوکا دیا ہے تو تم کیا کرو گی اس کا یقین کر لو گی؟" اس کا یہ سوال بہت عجیب تھا' پتا نہیں اس نے یہ کیوں پوچھا تھا' میں نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

"اگر وہ تمہارا بھائی ہو تو پھر؟" وہ سابقہ لہجے میں ہی بولا۔

"ہر انسان کا اپنا پوائنٹ آف ویو ہوتا ہے' لالہ' بابا کے بارے میں ایسی بات کہہ سکتے ہیں لیکن میں اسے نہیں مان سکتی کیونکہ جس جگہ سے میں بابا کو دیکھتی ہوں' وہاں سے بابا دنیا کے سب سے اچھے انسان ہیں۔" میں نے پورے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ جواب میں زیمل مسکرا دیا تھا۔

"تم تو بہت سمجھ داری کی باتیں کرتی ہو۔" وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے میں بے وقوف ہوں؟" مجھے ناؤ آیا تھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرا رہا تھا۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔ اچھا فرض کرو کہ اگر میں تم سے یہ بات کہوں کہ تمہارے بابا نے تمہیں دھوکا دیا ہے تو پھر۔۔۔ کیا تم میرا یقین کر لو گی؟"

میں نے اس کے لہجے میں کچھ چبھتا ہوا' کچھ نوکیلا سا' کچھ اکھڑا اکھڑا سا احساس اپنی سماعتوں میں اترتا ہوا محسوس کیا تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ آخر

زیمل یہ سوال کیوں پوچھ رہا تھا۔

"آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں اور مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں؟" میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے وہ ناراض ہو سکے لیکن میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو یکسر تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر واش روم میں چلا گیا تھا اور میں اپنی جگہ حیران و پریشان تھی کہ میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ وہ اس طرح سے بغیر کوئی جواب دیے اٹھ گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

میری یہ پریشانی آنے والے دنوں میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی' جب میں نے زیمل کے رویے کو یکسر تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ چڑچڑا اور بدمزاج ہو رہا تھا' وہ خود سے مجھے مخاطب نہیں کرتا تھا' اگر میں خود سے کچھ کہتی تو بھی وہ مختصر سا جواب دیتا تھا۔ اب اسے اکثر ملازموں پر غصہ آنے لگا تھا اور میں اس ساری صورتحال کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن آہستہ آہستہ مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ میرا رویہ بھی اس کے ساتھ تبدیل ہو رہا تھا۔

مجھے اپنے رویے کی اس تبدیلی کا پوری طور پر ادراک نہیں تھا لیکن لاشعوری طور پر میں اس کے سامنے آنے سے ڈرنے لگی تھی' اس کا کوئی کام میں خود نہیں کرتی تھی کہ کہیں وہ غلط نہ ہو جائے' جانے یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟ زیمل کی طرف سے مکمل خاموشی تھی' کوئی وضاحت نہیں تھی' کوئی تردید نہیں تھی' وہ جیسے مجھے میرے حال پر چھوڑ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ آفس سے واپس آیا تو وہ بہت اکھڑا اکھڑا لگ رہا تھا' اس کے کمرے سے بار بار کچھ پٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ الماری کا پٹ زور سے بند ہوا' دروازہ چرچرایا تھا' آٹھ مہینے پہلے والا زیمل اپنے کمرے میں بند تھا اور میں اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی' اس لیے خاموشی سے لاؤنج میں بیٹھی ان آوازوں کو سن رہی تھی' تھوڑی دیر بعد زیمل کی غصے میں دھاڑتی ہوئی آواز بھی آئی تھی یا شاید وہ مجھے ایسی لگی تھی۔

اس نے ملازمہ کو بلایا تھا' میرا دل اس کی آواز سن کر دھڑک اٹھا تھا اور جب ملازمہ نے مجھے آ کر کہا۔

"زیمل صاحب پوچھ رہے ہیں ان کی نیلے کور والی فائل آپ نے کہاں رکھی ہے؟"

میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتی ہوئی اس کے کمرے میں گئی تھی۔ کمرے کا حشر تو میرے اندازے سے زیادہ خراب تھا۔ ایسی حالت تھی کہ جیسے وہاں کسی نے کشتی لڑی ہو۔ زیمل جیسے نفاست پسند شخص کے ہاتھوں کمرے کا یہ حشر دیکھ کر میں ہراساں ہو گئی تھی۔

مجھے لگا کہ چند لمحوں کے بعد میرا بھی یہی حال ہونے والا تھا۔ زیمل کمرے میں موجود نہیں تھا پھر بھی مجھ پر بدحواسی طاری تھی۔ میں نے الماری کے سارے خانے چھان مارے لیکن فائل نہیں ملی۔ مجھے اپنی لاپروائی پر شدید تاؤ آ رہا تھا۔

تب ہی اچانک اپنے پیچھے مجھے زیمل کی آواز سنائی دی۔ وہ اتنا اچانک آیا تھا کہ میں اچھل پڑی تھی۔

"رہنے دو' مل گئی ہے فائل۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے دراز سے فائل برآمد کی تھی۔

ڈھیر ساری شرمندگی مجھے وہاں سے کوچ کر جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔

"تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو انا؟" اس کے لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی خفگی تھی' وہ میری کیفیت سے بخوبی واقف تھا پھر بھی میں نے اسے جھٹلانے کی کوشش کی۔

"جو آپ سے محبت کرتا ہو' اس سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ پھر تم مجھ سے اتنی ڈری ڈری' اتنی سہمی سہمی سی کیوں رہتی ہو؟" وہ نرم لہجے میں جیسے مجھ سے حقیقت اگلوانا چاہتا تھا۔

اس کا فقرہ غیر متوقع تھا' ایک معصوم سا پیارا سا احساس' چاہے جانے کا احساس' جس کو لہجے کے ہزارویں حصے نے مجھ پر منکشف کر کے مجھے نظریں

جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"نہیں تو۔۔۔ میں۔۔۔ میں تو آپ سے۔۔۔ ڈرتی نہیں ہوں۔" اور وہ طنزیہ انداز میں ہنسا تھا۔

"ہاں! تم مجھ سے ڈرتی نہیں ہو۔" وہ جیسے میرے فقرے کا لطف لے رہا تھا پھر وہ جارحانہ تیور کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ اس نے سختی سے میرا بازو تھاما اور کھینچ کر مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

"یہاں دیکھو۔" وہ ایک ہاتھ سے میرا بازو پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اشارہ کرتے ہوئے سختی سے بولا۔

"اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو' زرد ہو رہا ہے یہ بالکل۔ اپنے ہاتھ دیکھو' یہ کتنے سرد ہیں اور کیسے کانپ رہے ہیں۔ تم سے بولا بھی نہیں جا رہا اور تم کہہ رہی ہو کہ تم مجھ سے ڈرتی نہیں ہو' خوفزدہ نہیں ہو مجھ سے۔" اس کی انگلیاں میرے بازوؤں میں دھنس گئی تھیں۔ لہجے میں دبا دبا سا غصہ آنچ دے رہا تھا۔

وہ ہر حال میں اپنے سوالوں کا جواب چاہتا تھا۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا اور مجھے لگا کہ میں خوف کی انتہا پر پہنچ گئی ہوں' لفظ بالکل ہی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔

"کیوں انا! کیوں؟ تم ہمیشہ ہی مجھ سے ڈرتی کیوں رہیں۔ میں جسے تمہاری شرم اور جھجک سمجھ رہا تھا' وہ تو تمہارا خوف تھا۔ ایسا کون سا خوف تمہارے اندر چھپا ہوا ہے' جو تمہیں مجھ پر بھروسا کرنے سے روکتا ہے' آخر تمہیں مجھ پر اعتبار کیوں نہیں آتا انا؟" اب کی بار وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا تھا جیسے وہ طویل مسافت سے تھک چکا ہو۔

کچھ دیر قبل کے برعکس اس کا لہجہ بے بس تھا۔ الفاظ شکست و ریخت کا شکار تھے۔ جیسے وہ اپنے ضبط کی انتہا پر پہنچ کر تھک گیا ہو' جب خوف حد سے بڑھ جائے تو انسان بے خوف ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میں بھی بے خوف ہو گئی تھی۔

"ہاں میں ڈرتی ہوں۔ آپ سے' آپ کے غصے سے آپ اندر سے وہ نہیں ہیں' جو نظر آتے ہیں۔ آپ نے اپنے اوپر خول چڑھا رکھا ہے۔ میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

میرے بازوؤں پر اس کی گرفت ختم ہو چکی تھی' وہ بے یقین انداز میں مجھے دیکھتا ہوا الٹے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا پھر وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی' مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں کیا کہہ گئی تھی۔ یہ سب تو میں کبھی بھی نہیں کہنا چاہتی تھی پھر میں نے کیسے اتنا سب کچھ کہہ دیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا' اپنے رویے اور اپنے الفاظ پر۔ پھر مجھے اس کا چہرہ یاد آیا' زرد ہوتا ہوا چہرہ۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا مان' ٹوٹا ہوا یقین' یہ سب مجھے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی ایک ایک بات' اس کا ایک ایک رویہ' وہ سب کیا جھوٹ ہو سکتا ہے۔۔۔؟ اور اس شخص کا بکھرا ہوا سا وجود۔۔۔ کیا وہ بھی جھوٹ ہو سکتا ہے؟ کیا وہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟ نہیں' کبھی نہیں۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھ پر ایک عجیب سا انکشاف ہوا تھا۔

اس لمحے کے دکھ کے پلو سے بندھے ہوئے ایک جذبے کا احساس۔۔۔

رات کے دس بج رہے تھے' اسے گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی' مجھے اس کی فکر تھی اور اس کے انتظار میں ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے اسے بار بار خدا کی امان میں دیتے ہوئے مجھ پر وہ انکشاف ہوا تھا۔

میں زمل سے محبت کرنے لگی تھی۔

اس سے خوفزدہ ہونے کے باوجود اندر ہی اندر کہیں اس کی محبت نے مجھے اپنا بنا لیا تھا اور خود زمل۔۔۔ کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟ یونہی گفتگو کے دوران کہے ہوئے اس کے گہرے جملے ایک ایک کر کے مجھے یاد آ رہے تھے اور سب سے بڑھ کر بابا کا وہ فقرہ' جب بابا نے مجھے بتایا تھا کہ زمل نے خود مجھے پرپوز کیا تھا۔

کیا میں اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی دوسرا سی

ملاقاتوں میں ہی مجھ سے شادی کا فیصلہ کر لے؟ واقعی یہ محبت ہی ہو سکتی ہے۔ یہ چاہے جانے کا احساس کتنا خوبصورت ہے' چاہنے سے بھی زیادہ۔ اسی احساس نے مجھے میری ہی نظروں میں معتبر کر دیا تھا' مجھے ایک دم سے بہت بلند مقام پر لا کھڑا کیا تھا اور مجھے اس مقام پر پہنچانے والا زمل آفندی تھا۔

مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ زمل واپس آ جائے تو میں اس سے اپنے رویے کی معافی ضرور مانگوں گی۔ میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تھی۔

ایک گہرا سکون میرے دل میں اتر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب میں بالکل مطمئن بیٹھی زمل کا انتظار کر رہی تھی' تب ہی بابا کا فون آیا تھا۔ ان کی آواز بدلی بدلی سی لگ رہی تھی' جیسے وہ بہت تھک گئے ہوں۔ میرا دل ان کی آواز سن کر تڑپ اٹھا تھا۔ ان کی طبیعت خراب تھی' وہ چاہتے تھے کہ میں ان سے ملنے آ جاؤں اور ان کے لہجے نے مجھے تڑپا دیا تھا' تبھی زمل کی گاڑی کا ہارن بجا' میں جلدی سے چادر اور جوتا پہن کر بابا کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

زمل اپنے کمرے میں جا چکا تھا' میں بھی وہیں چلی گئی' مجھے اس طرح تیار کھڑا دیکھ کر شاید وہ حیران ہوا تھا۔

"تم کہیں جا رہی ہو؟" اس نے خود ہی پوچھ لیا تھا۔

"جی وہ میں بابا کی طرف جا۔۔۔" میرا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا' جب اس نے غصے سے میری بات کاٹی تھی۔

"اور اگر میں کہوں کہ تم نہ جاؤ تو پھر؟" وہ کاٹ دار لہجے میں بول رہا تھا۔

وہ مجھے جانے سے کیوں منع کر رہا تھا' میں الجھن میں تھی۔ اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی تھی۔

"میں تمہیں اس لیے منع کر سکتا ہوں کہ میں تمہارا شوہر ہوں' اس رشتے کے ناتے شاید اتنا اختیار تو ہے کہ میں تمہیں کہیں جانے سے روک سکوں یا نہیں؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

اس کا یہ روپ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

"زمل! ایکچوئلی بابا کی۔۔۔" اس نے ایک بار پھر مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔

"جاؤ انا! تمہیں اجازت ہے۔" لہجہ عجیب سا تھا۔ مجھے اس کے لہجے میں کوئی غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا جو اس دن سے پہلے کبھی میں نے زمل کے لہجے میں محسوس نہیں کیا تھا۔ مجھے ایسا کیوں لگا تھا کہ جیسے وہ مجھے آخری بار رخصت کر رہا ہو' مجھے مشکل ہو رہی تھی کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں پھر میں نے جانے کا فیصلہ ہی کیا۔

میں نے سوچا تھا کہ میں صبح ہی صبح واپس آ جاؤں گی' البتہ جانے سے پہلے میں اس سے اپنے اس رویے کی معافی مانگنا چاہتی تھی' میں لمحے بھر کو رکی تھی لیکن شاید مجھے رکنا نہیں چاہیے تھا۔

"آئی ایم سوری زمل! مجھے اپنے آج کے رویے پر بہت افسوس ہے۔" میں نے دلی شرمندگی سے کہا تھا۔

"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے انا! تمہیں لوگوں کی پہچان ہی نہیں ہے۔" وہ جیسے مجھے مارجن دے رہا تھا' بے وقوف ہونے کا مارجن' نا سمجھ ہونے کا مارجن' بے خبر ہونے کا مارجن' پتا نہیں وہ اس طرح کیوں کہہ رہا تھا۔

"تم مجھے جھوٹا کہہ رہی تھیں نا۔ انا! تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے لیکن درحقیقت تمہیں علم ہی نہیں ہے کہ تمہیں کس نے دھوکا دیا ہے۔" مجھے اب بھی سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

"مجھے افسوس ہوتا ہے تمہاری لاعلمی پر۔ تم جسے دنیا کا سب سے عظیم انسان سمجھتی ہو' وہی شخص تمہیں دھوکا دیتا رہا ہے اب تک اور تمہیں علم ہی نہ ہو سکا۔ تم آج تک جان ہی نہیں سکیں کہ اس کا اصل کیا ہے؟ تمہیں لگتا ہے کہ میں نے اپنے چہرے پر نقاب چڑھا رکھا ہے لیکن تمہیں یہ علم نہیں کہ اور کون کون تمہیں نقلی چہرے کے ساتھ ملتا رہا ہے۔" وہ

تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا۔

اور میں ساکت کھڑی تھی۔

"تم مجھے جھوٹا کہہ رہی تھی نا انا! جھوٹا میں نہیں، جھوٹا وہ ہے۔" وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا جیسے اس کا ضبط جواب دے گیا ہو۔

"کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"تمہارا باپ، اسفندیار آفندی۔" وہ ایک جھٹکے سے بول گیا تھا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میرے بابا کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ جھوٹے نہیں ہیں۔" میں نے شدت کے ساتھ اپنے بابا کا دفاع کیا تھا۔

"مجھے پتا تھا کہ تم یہی کہوگی کیونکہ تم اس شخص کے صرف ایک ہی روپ کو جانتی ہو۔" وہ بالکل لالہ کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کون سا روپ ہے بابا کا جو صرف اسے معلوم ہے اور جس سے میں بے خبر تھی۔

"تمہیں یاد ہے انا! جب تمہارے بابا نے تمہیں میرے پروپوزل کے بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے کیا کہا تھا؟" اگرچہ پچھلے کئی گھنٹوں سے میں اسی بارے میں سوچ رہی تھی لیکن پھر بھی الجھ سی گئی۔

"بابا نے کہا تھا کہ آپ نے مجھے پروپوز کیا ہے پھر انہوں نے میری پسند۔۔۔" اس نے ایک بار پھر میری بات کاٹی تھی۔

"غلط، بالکل غلط۔ تمہارا باپ خود تمہارا پروپوزل لے کر میرے پاس آیا تھا۔" اس نے جیسے دھماکہ کیا تھا۔

یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ معتبر ہونے کا احساس کہ میں زحل کی پسند تھی، ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا تھا اور میرا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ میں بیڈ پر بیٹھتی۔ چلی گئی تھی۔

"اور جانتی ہو، اپنے ڈوبتے ہوئے بزنس کو بچانے کے لیے انہوں نے تمہارا سہارا لیا تھا۔ میں نے تمہیں پروپوز ضرور کیا تھا لیکن پروپوزل انہوں نے فوراً "ریجیکٹ" کر دیا تھا لیکن جب ان کا بزنس ڈوبنے لگا تو وہ خود تمہارا رشتہ لے کر میرے پاس آئے تھے۔" وہ تفصیل بتا رہا تھا۔ اتنی بڑی بات وہ ایسے ہی تو نہیں کہہ سکتا تھا۔

"تو کیا بابا نے مجھے فروخت کیا تھا۔۔۔ میری بولی لگائی تھی؟" مجھے اپنا وجود بے حد ارزاں لگا تھا۔

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ بابا کیا میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں؟" ایک سوال بلند ہوا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" میرا دل کبھی نہیں مان سکتا تھا۔

"بابا میرے ساتھ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔" میرے دل نے زور سے گواہی دی تھی (زحل کے خلاف)۔

"ہاں، یہ شخص جھوٹا ہے، بالکل جھوٹا ہے۔"

زحل سے میری نوزائیدہ محبت بابا کے ساتھ میری اس محبت سے ہار گئی تھی جو میں نے اپنی زندگی کے پہلے لمحے سے ان سے کی تھی۔ جب مجھے محبت کا مطلب بھی نہیں آتا تھا۔ وہ محبت بہت مضبوط تھی، بہت گہری تھی، اس کی جڑیں میری روح تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں سے کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔ کوئی لاکھ چاہے پھر بھی نہیں۔

میں ہنس دی تھی۔

زحل ناکام ہو گیا تھا، وہ میرے اس طرح ہنسنے پر حیران تھا۔

"جھوٹ تم بولتے ہو مسٹر زحل آفندی! میرے بابا نہیں۔ وہ مجھے کبھی بیچ نہیں سکتے اور وہ بھی تم جیسے شخص کے ہاتھ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے ایسا کیا ہے تو جہاں انہوں نے مجھے بیچا ہے، وہیں تم نے بھی تو مجھے خریدا ہے۔ اگر تمہیں اس بات کا احساس تھا تو تم نے اس وقت انکار کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے میرا مول لگایا اور تم نے وہ مول ادا کیا۔ تو پھر جھوٹے تو تم بھی ہوئے نا، دھوکا تو تم نے بھی مجھے دیا ہے نا۔" میں سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر اپنا اور بابا کا مقدمہ بہادری سے لڑ رہی تھی۔

اپنی بات پر میں نے زحل کی آنکھوں میں کوئی دکھ

ابھرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ دکھ میرے دکھ کے آگے بہت چھوٹا تھا۔ مجھے واقعی لوگوں کی پہچان نہیں تھی۔ میں واقعی زحل کو پہچان نہیں سکی تھی۔ ہمیشہ بابا کے ساتھ اس کا رویہ سرد مہری لیے ہوتا تھا اور میں سمجھ ہی نہیں پاتی تھی، وہ تو میرے بابا کے ساتھ محبت سے جلتا تھا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو لوگوں کو چیزیں سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، انہیں اپنے تصرف میں رکھنا چاہتے ہیں، وہ بھی مجھ پر اپنے نام کا ٹیگ لگا کر مجھے اپنے گھر میں سجانا چاہتا تھا اور اسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ میں اس کے علاوہ کسی کے بارے میں بھی سوچوں، چاہے وہ میرا سگا باپ ہی کیوں نہ ہو اور اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اس نے ہر حربہ آزمایا، حتیٰ کہ محبت کو بھی۔۔۔۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو خود سوچو اس دن انہوں نے مجھے ہی تمہارے گھر کیوں بھیجا کہ وہ کراچی جا رہے ہیں، یہ کام تو کوئی چپڑاسی بھی کر سکتا تھا۔" ایک گھٹیا الزام لگا کر اس نے اپنی ذہنیت خود ہی بے نقاب کر دی تھی۔

"تم جیسی گھٹیا ذہنیت کے لوگ یہ ہی بات سوچ سکتے ہیں۔" جب وہ کوئی لحاظ نہیں رکھ رہا تھا تو میں کیوں رکھتی۔

"ہاں، میں گھٹیا ذہنیت کا ہوں اور تمہارا باپ کیا ہے؟ چلو اس بات کو چھوڑو۔ اس دن بھی تو وہ تمہیں یہ بتا کر اس گھر میں چھوڑ گئے تھے کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، حالانکہ اگر تم سے ملنا ہوتا تو میں خود تمہارے گھر جا سکتا تھا۔ لیکن تمہیں بھی اس شخص نے الزام دیا تاکہ تم۔۔۔" وہ اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہا تھا لیکن مجھ سے سنا نہیں گیا، میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

"بس کرو زحل آفندی! بس کرو۔ تم جو الزام بابا پر لگا رہے ہو اس سے کہیں زیادہ بڑے الزام تمہاری ذات پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ تم تو وہ شخص ہو جسے رشتوں کا شعور ہی نہیں ہے۔ تمہیں میرے بابا بھی اپنے رقیب لگتے ہیں۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری کسی بے جان جائیداد کی طرح تمہارے زیر تسلط رہوں۔ کوئی تیسرا شخص میرے نزدیک تک نہ آئے، اسی لیے تم میرے دل میں بابا کے لیے نفرت پیدا کرنا چاہتے ہو لیکن تم نہیں جانتے، وہ مجھے کتنے پیارے ہیں۔ تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے کہ وہ میرے لیے کیا ہیں؟ وہ میرے باپ بھی ہیں، میری ماں بھی، بھائی بھی اور دوست بھی۔" میری آواز بھرا گئی تھی۔

"مجھے پتا تھا تم مجھے ہی الزام دوگی، تم کبھی میری باتوں کا یقین نہیں کروگی لیکن تم اتنا تو سمجھ سکتی ہو نا کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر نہیں اجاڑ سکتا لیکن تمہارا باپ یہ کرنے سے بھی باز نہیں آئے گا۔ دیکھنا ایک دن وہ تم سے کہے گا کہ تم مجھے چھوڑ دو، دیکھنا انا! ایک دن وہ تم سے یہ بھی کہہ دے گا۔"

"وہ نہ بھی کہیں تو بھی میں تمہیں چھوڑ دوں گی لیکن میرے بابا کبھی ایسا نہیں کہیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

اسی دن میں زحل آفندی کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی تھی۔ جس شخص پر اعتبار ہی نہ ہو اس کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ!

☼ ☼ ☼

میں بابا کو نہیں بتا سکی تھی کہ میں وہ گھر چھوڑ آئی ہوں۔ مجھے پتا تھا انہیں دکھ ہوگا، شدید دکھ۔ وہ تو میرے وہاں موجود ہونے پر بہت خوش تھے، اتنے خوش جتنے چھوٹے بچے اپنا من پسند کھلونا ملنے پر ہوتے ہیں، میں انہیں خوش دیکھ کر خوش ہوا کرتی تھی۔ ان کے سامنے میں ہنستی رہتی تھی لیکن ایک دکھ تھا، ایسا دکھ جو اندر ہی اندر میری ہر ہنسی، ہر قہقہے کا گلا گھونٹ دیتا تھا اور وہ دکھ میری ذات سے ہوتا ہوا میرے بابا کی ذات تک چلا جاتا تھا۔

اور پھر میرے اور بابا کے درمیان وہی لمحہ دھیرے دھیرے دبے پاؤں چلتا ہوا آ گیا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے بابا کو یہ سوال پوچھنے کا خیال آ جاتا کہ اتنے دنوں سے زحل مجھ

سے ملنے کیوں نہیں آیا۔ شاید وہ آفس سے بھی غائب تھا ورنہ وہ یہ سوال خود اس سے پوچھ لیتے۔

جب بیٹی کو رخصت کر دیا جائے تو وہ پرائی ہو جاتی ہے۔ آپ اس سے دور رہ کر بھی پریشان تو اس رہتے ہیں اور اگر وہ ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس آ کر رہنا چاہے تو آپ اور بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ بابا بھی شاید اتنے ہی پریشان تھے۔ مجھ سے یہ ساری صورتحال سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

اس دن میں اپنے ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔ یہ قیامت کل بھی تو گزرنا ہی تھی تو پھر آج کیوں نہیں۔ میں نے بابا کو صاف بتا دیا کہ میں اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گی۔ کوئی وجہ نہ میں بتا سکی تھی اور نہ انہوں نے پوچھی تھی۔ وہ میرے نبض شناس تھے، میرے رازداں تھے، دوست تھے، شاید وہ میرے دکھ کو خود ہی جان چکے تھے۔

اس دن مجھے بہت شدت سے رونا آیا تھا اور اس سے بھی کہیں زیادہ شدت سے مجھے غصہ آیا تھا اس شخص پر جو اس آزار کا ذمہ دار تھا۔

"زنعل آفندی! کیا ہوتا اگر تم میری زندگی میں نہ آتے، میں اپنے ہی گھر میں اجنبی تو نہ بنتی۔ کیا بگاڑا تھا میں نے اور بابا نے تمہارا کہ تم نے ہم دونوں کی زندگیوں کو ایک دوسرے کے لیے سزا بنا دیا ہے۔ مجھے تم سے نفرت ہے زنعل آفندی! شدید نفرت۔" میں نے زنعل کو خوب برا بھلا کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شاید میری خاموشی کی وجہ سے بابا نے دوبارہ یہ ایشو نہیں چھیڑا تھا لیکن اب سے تھوڑی دیر پہلے وہ میرے کمرے میں آئے تھے۔ "مجھے نہیں پتا انا! کہ تمہارے درمیان کیا بات ہوئی ہے لیکن میں نے تمہاری آنکھوں میں زنعل کے لیے نفرت دیکھی ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ تم اس نفرت کے ساتھ اس رشتے کو آگے تک لے جا سکو گی۔" وہ تمہید باندھ رہے تھے۔

شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ میں اور زنعل ایک دوسرے سے مل کر اس جھگڑے کو سلجھائیں۔ شاید وہ ہمارے درمیان مفاہمت کا کوئی رستہ کھولنا چاہتے تھے لیکن نہیں، شاید مجھے دھوکا ہوا تھا، میری سماعتیں ٹھیک طرح سے سن نہیں پا رہی تھیں۔ میں نے تو کچھ اور سنا تھا، بابا کہہ رہے تھے۔

"اس لیے مجھے تمہارے لیے یہی بہتر لگا ہے کہ تم زنعل سے خلع لے لو۔ میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ آخری فیصلہ تمہارا ہی ہو گا اور مجھے تمہارا ہر فیصلہ قبول ہو گا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں زنعل آفندی سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔"

الفاظ تھے کہ قیامت، مجھے لگا تھا کہ میرے کان سننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں، آنکھیں دھند کے پردے کے پیچھے کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ بابا نے اور کیا کہا میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں خاموشی سے انہیں کمرے سے نکلتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

"کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر نہیں اجاڑ سکتا۔" کوئی بہت تیز آواز آئی تھی۔

"تم زنعل سے خلع لے لو۔" اس سے بھی تیز آواز آئی تھی۔

"میرے بابا کبھی ایسا نہیں کہیں گے۔" ایک مدھم سی آواز آئی تھی۔

"دیکھنا ایک دن وہ تم سے کہے گا کہ تم مجھے چھوڑ دو۔" ایک اور آواز۔

"نہیں، وہ ایسا نہیں کہیں گے۔"

"انا! تم زنعل سے خلع لے لو۔"

آوازیں اور اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ میری سماعتیں بے حس ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

نہ آنسو بہتے ہیں، نہ درد تھمتا ہے، یہ کیا ہو گیا ہے؟ پل بھر میں میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ شاید میں سمجھ نہیں سکی ہوں کہ بابا نے کیا کہا ہے یا شاید وہ ہی کچھ غلط کہہ گئے ہیں۔

جب سے وہ یہاں سے گئے ہیں، میں اسی جگہ بیٹھی ہوں۔ زنعل کہتا تھا کہ بابا مجھے مجبور کریں گے کہ میں اسے چھوڑ دوں اور مجھے دعویٰ تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا مگر ہوا وہی ہے جو زنعل نے کہا تھا تو اس کا مطلب ہے زنعل سچ بولتا تھا۔

ایک بار بابا نے کہا تم میڈیکل لائن چھوڑ دو، میں نے چھوڑ دی۔ پھر انہوں نے کہا کہ زنعل سے تمہارا نکاح ہے، میں یہ بھی مان گئی اور اب انہوں نے کہا ہے کہ میں زنعل کو چھوڑ دوں، کیا اس بار بھی میں ان کی بات مان لوں؟

نہیں پتا میں کیا فیصلہ کروں گی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ فیصلہ مجھے توڑ کر رکھ دے گا۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میری بقا ان دونوں لوگوں کے بغیر ممکن نہیں، وہ دونوں ہی مجھے عزیز ہیں، وہ دونوں ہی میری زندگی ہیں، وہ دونوں ہی... اب بھی...

☼ ☼ ☼

مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ میں ہوں؟ زنعل آفندی! کیا یہ تم ہو؟ میں نے اسے اپنی زندگی سے جانے دیا؟ "میں نے انا کو، اپنی انا کو کیسے جانے دیا؟ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک سکتا تھا، اتنا حق تو تھا مجھے، میں اسے روک سکتا تھا۔

"انا! نہ جاؤ، میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکوں گا۔" مگر میں نے اسے جانے دیا، کیوں؟ میں زین کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ کیا وضاحت دوں گا کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟

سفید کاغذ کا ایک ٹکڑا ابھی میرے سامنے میز پر پڑا ہے، ایک بے رحم، سفاک حکم نامہ، میرا مرگ نامہ، جو میرے دستخط کا منتظر ہے، جس کے بعد مجھے موت آ جائے گی لیکن مر تو میں چکا ہوں، بہت پہلے... جب وہ میرے سامنے روئی تھی اور اس کی کالی گھور آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تھے، پہلے اس کی محبت اور اب اس کے آنسوؤں نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

☼ ☼ ☼

میں نے پہلی بار اس کا ذکر زین سے سنا تھا۔ وہ زین کی بہن تھی اور زین میرا دوست... بہت گہرا دوست۔ جب میں زندگی میں ہر رشتہ کھو چکا تھا تب وہ اپنی دوستی کا رشتہ منوانے آیا اور اس کی شکل میں مجھے میرے تمام تر گمشدہ رشتے واپس مل گئے تھے۔

وہ کبھی اپنے گھر کو یاد نہیں کرتا تھا، شاید وہ دنیا میں کسی کو بھی یاد نہیں کرتا تھا، سوائے ایک ہستی کے جو اس کی بہن تھی "انا آفندی"۔ وہ اس طرح اس کے بارے میں فکر مند رہتا تھا جیسے وہ اسے جلتی ہوئی آگ میں چھوڑ آیا ہو، پہلے پہل تو مجھے اس کی باتیں سن کر صرف حیرت ہوا کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے سننا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ باتیں ہی اتنی سنجیدگی سے کرتا تھا۔

"پتا نہیں وہ شخص میری بہن کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟" وہ اکثر جذباتی ہو کر کہتا۔

"وہ شخص کوئی جلاد تو نہیں ہے، اس کا باپ ہے، وہ کیوں اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا؟" بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ پتا نہیں وہ اپنے باپ سے اتنا بدگمان کیوں تھا۔

"تم نہیں جانتے اسے، وہ شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسے شوق ہے لوگوں پر حق ملکیت جتانے کا، دوسروں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کا، وہ ساری دنیا کو اپنے اصولوں پر چلانا چاہتا ہے، انا کو بھی اس نے ٹریپ کر رکھا ہے۔ وہ سچ مچ اسے اپنی انا سمجھتا ہے اور اسی انا کے زعم میں وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" پتا نہیں کیوں مجھ سے اس کی یہ فکر مندی ہضم نہیں ہوتی تھی۔

"اگر تمہیں اس کی اتنی ہی فکر تھی تو تم اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر کیوں آ گئے؟ اگر وہاں رہتے تو اس کی کچھ مدد تو کرتے۔" وہ ہنس دیتا تھا۔

"اگر میں وہاں رہتا۔" وہ میری طرف دیکھنے لگتا "تو بھی میں کچھ نہ کر سکتا۔ میں نے خود سنا تھا اس نے اپنے بھائی سے کہا تھا "انا! میرے پاس آپ کی امانت ہے" وہ میری معصوم بہن کو اپنے فیصلے کی بھینٹ چڑھا دے

گا' وہ اس کی شادی اپنے جاہل اجڈ بھتیجے سے کردے گا اور میں اس کا فیصلہ نہیں بدل سکوں گا۔ کوئی بھی اس کا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔"

وہ اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے واقعی بہت محنت کر رہا تھا۔ وہ وہ جاب کرتے کرتے وہ تھک جاتا تھا اور جب بھی مجھ سے ملتا تو یہی موضوع لے کر بیٹھ جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کام کرے لیکن وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"یار! عجیب آدمی ہو تم' جب سب کچھ طے کر رکھا ہے تو پھر خوامخواہ جلنے کڑھنے کا کیا فائدہ' جا کر مل آؤ انا سے۔" میں اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا۔

"ملنے سے کیا ہوگا' حالات بدل جائیں گے کیا؟" وہ پھر مستقبل سے ماضی میں پہنچ جاتا' مجھے اس کی باتیں منطق سے عاری اور جذباتی سی لگتی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوگا زین! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے جیسا تم سوچ رہے ہو' ویسا کچھ بھی نہ ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انا کوئی بچی تو نہیں ہے' اتنی سمجھ تو اس میں بھی ہوگی' وہ کیوں کسی جاہل سے شادی کرے گی؟" میں اس کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھنے لگا تھا۔

"یہی تو مسئلہ ہے' انا کا ہر فیصلہ وہ کرتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اس سے منوا لیتا ہے اور وہ بے وقوف لڑکی ... اسے کچھ علم ہی نہیں ہے' پتا نہیں کیا جادو کر رکھا ہے اس شخص نے اس پر کہ اسے اس کے سوا دنیا میں کوئی اور قابل اعتماد نظر ہی نہیں آتا۔ تمہیں پتا ہے نہعل! وہ مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ سارا قصور میرا ہے' پتا نہیں کب وہ میری محبت کو سمجھے گی' اس کے لیے تو دنیا کا ہر رشتہ اس کا باپ ہے ... باپ تو وہ میرا بھی ہے مگر۔"

وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا اور ہمیشہ ایک بات کہتا۔

مجھے لگتا ہے وہ اس کی شادی کسی گدھے سے کرنے کو تیار ہو جائے گا اور انا انکار نہیں کرے گی۔"

ایسے ہی نہ جانے کب وہ انجانی' ان دیکھی لڑکی میری سوچوں کا محور بن گئی۔ شاید مجھے اس سے ہمدردی تھی' میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ یا مجھے اس میں کوئی کشش محسوس ہو رہی تھی کیونکہ میرے چاروں طرف جو لڑکیاں تھیں وہ ان سے بہت مختلف تھی۔ کیا اکیسویں صدی میں بھی ایسی لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔

زین کی پریشانی نے مجھے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ شادی تو مجھے کرنی ہی تھی اور یہ بھی طے تھا کہ مغرب زدہ آزاد خیال لڑکیاں میری سوچوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں' پھر کیا حرج ہے کہ اگر اس لڑکی انا آفندی کو دیکھ لیا جائے۔ وہ لڑکی باقی دنیا کی لڑکیوں سے مختلف تھی۔ جانے کس دنیا کی باسی تھی۔ میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زین کو علم نہیں تھا کہ میں پاکستان کیوں جا رہا ہوں' نہ ہی اس نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پاکستان آ کر سب سے پہلے میں نے حالات کا جائزہ لیا تھا' اسفندیار آفندی کا کاروبار مسلسل خسارے میں جا رہا تھا اور یہ میرے لیے سازگار ترین حالات تھے۔ میں نے اس کے ساتھ ایک بڑی ڈیل کی تھی۔

ایک دیوالیہ ہوتی فرم کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ سراسر خسارے کا سودا تھا لیکن میں وہاں سود و زیاں کا حساب لگانے نہیں آیا تھا۔ ہماری آفر یقیناً "حیران کن" تھی اسی لیے اسفندیار آفندی نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ یوں میری اس سے ملاقات ہالیڈے ان میں ہوئی۔

اس ملاقات میں میں صرف اس کی شخصیت کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ ظاہری طور پر تو وہ ایک ویل ڈریسڈ مہذب اور مہذب انسان نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں وہ کیا تھا یہ شاید اس کا بیٹا ہی بہتر جانتا تھا۔

لگاتار دو تین مہینے تک میری اس سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔

یہاں تک کہ میں نے اس کی آنکھوں میں لالچ کی جھلک دیکھی۔ وہ میری ذہانت اور شخصیت سے یقیناً "متاثر ہو رہا تھا اور یہی میں چاہتا تھا یہی وہ وقت تھا جب میں اس سے یہ بات کر سکتا تھا۔

میں انا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مجھے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ اسفندیار آفندی سے ملنے کا بہانہ کر کے میں اس کے گھر گیا تھا اور پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا جس کی پسند ناپسند سب کچھ میں جانتا تھا۔ میری نظر اس پر پڑی اور پھر واپس نہیں لوٹی۔ اس کے چہرے پر ہی ٹھہر گئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ مجھے لگا حسن خود مجسم صورت میں میرے سامنے کھڑا ہے۔ کیا کوئی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے؟ اور کیا اتنے بیش قیمت حسن کا مالک' اس کی قدر و قیمت سے اتنا انجان بھی ہو سکتا ہے جتنی وہ تھی۔

اسے شاید علم ہی نہیں تھا کہ وہ کس قدر خطرناک حسن کی مالک تھی۔ اس لمحے بھر کی ملاقات میں میں صدیاں گزار آیا تھا۔ اور اس سارے عرصے میں وہ بس مجھے دیکھتی رہی تھی۔

وہ بولی تھی اور اس کی آواز جیسے ڈھیر سارے جلترنگ ادھر ادھر میں بج رہے ہوں۔ وہ جتنی حسین تھی اس سے بھی زیادہ حسین اس کی آواز تھی۔ اس دن میں سارا وقت دیوانوں کی طرح بس ایک اس لڑکی کے بارے میں سوچتا چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے انا آفندی کو پرپوز کیا تھا۔

میری بات پر وہ جتنا حیران ہوا تھا اتنی ہی مجھے توقع تھی۔ اس نے بغور میری طرف دیکھا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ میری بات پر اس کا چہرہ سوائے حیرانی کے ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا' اس لیے میں اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے مجھے انکار کر دیا۔

مجھے اس کے انکار سے بہت افسوس ہوا تھا' میں جو سمجھتا تھا کہ انا کو اپنانے کا فیصلہ میں نے زین کی ہمدردی میں کیا تھا۔ میں غلط تھا' انا کو اپنانے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ میں خود بھی انا کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

☼ ☼

امریکہ سے زین کی کال موصول ہوئی وہ کہہ رہا تھا۔

"نہعل! ایک عجیب سی بات ہوئی ہے۔" وہ حیرت سے بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہعل! ابا ابو اپنے جاہل بیٹے کا پرپوزل لے کر انا کے لیے آئے تھے۔" مجھے لگا کہ میری سانس الجھنے لگی۔

"تو کیا مجھے ریجیکٹ کرنے کی یہ وجہ تھی؟" میں سوچ رہا تھا۔

"لیکن حیرت کی بات ہے نہعل کہ بابا نے وہ پرپوزل ٹھکرا دیا ہے۔" میرا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا مجھے بھی زین کی طرح شدید حیرت تھی۔ ہم دونوں اندازے لگاتے رہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں واپس جاتا ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا۔

اسفندیار آفندی خود مجھ سے ملنے آیا تھا میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور جب مجھے اس کی آمد کا مقصد پتا چلا تو میری حیرت انتہا تک پہنچ گئی۔

"تمہارے جانے کے بعد میں نے تمہارے پرپوزل پر بہت غور کیا ہے' میں تمہارا پرپوزل قبول کر سکتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔" وہ بہت پرسکون انداز میں بولا تھا۔ وہ وہی پرپوزل لے کر میرے پاس آیا تھا جسے وہ خود ریجیکٹ کر چکا تھا۔

"کیسی شرط؟" میں نے پوچھا تھا۔

"میری بیٹی کا لائف پارٹنر بننے کے لیے تمہیں میرا بزنس پارٹنر بننا پڑے گا۔"

اس نے بڑی آسانی سے اپنی شرط میرے سامنے رکھی تھی۔ اس کی بات سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے ایک زوردار گھونسا رسید کروں لیکن بہت مشکل

Zubinovelszone.com

سے میں نے خود پر قابو پایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل چاہا کہ میں انکار کر دوں لیکن پھر مجھے انا کا خیال آیا اور میں نے وہ پرپوزل قبول کر لیا۔

اس دن مجھے یقین آ گیا کہ زین اس شخص کے بارے میں جو بھی کہتا تھا بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ اس شخص سے نفرت کا شدید ترین احساس میرے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ لیکن میں نے خود پر قابو پایا تھا۔ شاید وہ منتظر تھا کہ میں اس سے کوئی سوال پوچھوں گا لیکن میں خاموش رہا تھا کیونکہ مجھے اس کی اصلیت کے بارے میں پہلے سے ہی علم تھا۔

جب ہمارے درمیان ساری بات طے ہو گئی تو اس نے کہا تھا کہ اس فیصلے کے لیے انا کی پسند بھی ضروری ہے۔ مجھے حیرانی ہوئی تھی جب وہ سب کچھ طے کر ہی چکا تھا تو پھر اس تردد کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر بالفرض انا انکار کر دیتی تو کیا پھر وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیتا۔؟

بہرحال وہ یہ چاہتا تھا کہ میں ایک بار انا سے مل لوں۔

☼ ☼ ☼

جب ہماری دوسری ملاقات ہوئی تب مجھے علم ہوا کہ ہماری پہلی ملاقات کی طرح اس ملاقات میں بھی اسفند یار آفندی کی شعوری کوششوں کا دخل تھا۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اس دن اس نے پنک سوٹ پہنا ہوا تھا‘ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ جانے کہاں گم تھی‘ ارد گرد کے ماحول سے بالکل بے خبر وہ جیسے اس دنیا میں ہی نہیں تھی۔ اس کے چاروں طرف بیل کے پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جسے وہ نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی۔ لیکن شاید وہ اس سے بھی بے خبر تھی۔۔۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ میری آمد سے لاعلم تھی۔ اس لمحے وہ لڑکی مجھے بالکل بھی نارمل نہیں لگی تھی۔ جس قسم کے ماحول میں وہ رہ رہی تھی اس میں ایسا ہونا بھی ناممکن نہیں تھا۔

بہت سارے رشتوں سے محرومی شاید اسے دھیرے دھیرے پاگل بنا رہی تھی۔ اس ملاقات میں سارا وقت میں غور سے اس کے رد عمل نوٹ کرتا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ میری موجودگی سے ۔۔۔ تھی‘ جب وہ میری طرف متوجہ ہوئی تو وہ چونک تھی‘ جیسے وہ مجھ سے خوفزدہ ہو گئی ہو۔ اس کے سارا وقت دھیرے دھیرے کانپتے رہے تھے۔

”شاید یہ ماحول کا اثر ہو‘ یا کسی اجنبی سے ملنے ہونے والا خوف ہو۔“ میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کیا تھا۔

اگر وہ میری موجودگی میں اتنا خوفزدہ تھی تو رات اکیلی کیسے رہے گی۔ یہی سوچ کر میں نے اسے تسلی تھی‘ کچھ ہدایات اور اپنا کارڈ دیا تھا۔ اس ڈرے ڈرے سہمے سہمے روپ میں وہ میرے اندر سوچ کی کھڑکی کھول گئی تھی۔

میں اسے مزید اس ماحول میں نہیں چھوڑ سکتا اس لیے میں نے اسفند یار آفندی پر نکاح کے لیے ڈالا تھا۔ اور یوں انا میری زندگی میں داخل ہو میرے معمولات میں باضابطہ طور پر شامل ہو گئی۔

اس دن میں نے زین کو فون کیا تھا اور مصنوعی تشویش بھر کر کہا تھا۔

”زین یار! بڑا غلط ہو گیا ہے تو اپنے باپ کے بارے میں جو کہتا تھا وہ واقعی سچ تھا۔“ اور ادھر وہ پریشان تھا۔

”کیا ہوا؟“ بے اختیار اس نے پوچھا تھا۔ اور نے اپنی مسکراہٹ بمشکل دباتے ہوئے کہا تھا۔

”یار! تیرے باپ کو انا کے لیے ایک عدد شا... گدھا مل گیا ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ اس نے انا کی شادی کر دی؟“ وہ ... سمجھا تھا لیکن بہت پریشان تھا۔

”ہاں انا کی شادی ہو گئی ہے اور جس سے ہے‘ اسے واقعی وہی شخص انا کے لیے پسند ... تھا۔“ میں نے اسے اور دہلایا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ اس نے پوچھا تھا تو میں نے ... تھا۔

”ویسے اتنا بھی برا نہیں ہے وہ۔ بس پچاس سال کا ہو گا۔“ ادھر جیسے وہ غصے سے پھٹ پڑا تھا جیسے وہ اس شخص کو جان سے ہی مار دے گا۔

”ہے کون وہ؟“ اب کی بار پہلے والی سنجیدگی سے میں نے کہا تھا۔

”اس کا نام ہے۔“ زحل علی آفندی۔“ اور ادھر سے اس کی چیختی ہوئی آواز کے ساتھ ہی گالیوں کا ایک طوفان آیا تھا‘ بہت قریبی دوستی کے باوجود زین نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں انا سے شادی کر لوں لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔

”لیکن یار! یہ ہوا کیسے؟“ وہ جاننے کے لیے بے چین تھا اور میں نے اسے اس وعدے پر سب کچھ بتایا تھا کہ وہ انا کو کچھ نہیں بتائے گا۔

”اور تم کب آ رہے ہو پاکستان؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”جب تیرے سات آٹھ بچے ہو جائیں گے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تھا پھر خود ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”بہت جلد آؤں گا میں دراصل عمارہ کے امی ابو سے مل لوں‘ پھر اسے تیری بھابی بنا کر ہی لاؤں گا۔“

وہ بہت خوش تھا اور میں‘ میں تو جیسے آسمان میں اڑ رہا تھا‘ خوشی انسان کو کتنا ہلکا پھلکا کر دیتی ہے۔ دل سے سارے بوجھ اتار دیتی ہے۔

☼ ☼ ☼

نکاح کے بعد میں ایک بار بھی انا سے نہیں ملا تھا حالانکہ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت میرے سامنے رہے لیکن میں نے اپنے دل پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والی اس تبدیلی کو تسلیم کرنے کے لیے اپنا پورا وقت لے‘ یوں بھی اس کے پیپرز ہونے والے تھے۔ اس دوران میں نے گھر ڈیکوریٹ کروایا تھا۔ بزنس کی کچھ صورت حال دیکھی تھی اور باقی سارا وقت میں انا کے بارے میں معلومات جمع کرتا رہتا تھا۔ کبھی زین سے‘ کبھی بوا سے اور کبھی اس کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

اس دن مجھے صبح صبح ملازمہ کے ذریعے اس کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ ایک خوشگوار سا احساس میرے دل کو چھو گیا تھا وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تھی؟ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔ انا جیسی لڑکی سے ایسے کسی قدم کی میں چاہتے ہوئے بھی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ تو شاید سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لیتی تھی۔ پھر اس کا خود مجھ سے ملنے آنا‘ یہ حیرت کی بات ہی تو تھی۔ اور جب روانی میں میں اپنی اس حیرت کا اظہار اس کے سامنے کر گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں غصہ اور احساس توہین اترتا ہوا دیکھا تھا‘ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم تبدیل ہو گئے تھے‘ جیسے اسے یہ سب برا لگ رہا ہو۔

مجھے لگا تھا کہ وہ خود اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی‘ شاید اسفند یار آفندی اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے یونہی اندھیرے میں تیر چلایا اور میرا تیر عین نشانے پر لگا۔ وہ واقعی اسفند یار آفندی کے کہنے پر آئی تھی لیکن میں نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اس کی آمد سے بے خبر تھا۔ میں اس کا اپنے باپ پر قائم بھرم قائم ہی رکھنا چاہتا تھا لیکن خود مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اسفند یار آفندی نے ایسا کیوں کیا تھا۔

بہرحال انا کا میرے گھر میں آنا مجھے بہت اچھا لگا‘ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت شرمائی سی تھی‘ دبی دبی سی‘ اپنے خول میں سمٹی ہوئی۔ وہ محض ہوں‘ ہاں میں مجھے جواب دے رہی تھی۔ لیکن میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ بغیر مجھے ٹوکے میری باتیں سن رہی تھی۔ اس لمحے اس سے باتیں کرنا‘ اس کی جھکی جھکی سی پلکوں کو دیکھنا اور دیکھتے رہنے کی خواہش کرنا۔ کتنا دلکش لگ رہا تھا۔ وہ لمحے کتنے حیات آفرین تھے میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس سے اپنے اور اس کے رشتے کے حوالے سے کوئی اچھی سی‘ کوئی منفرد سی بات کہوں لیکن مجھے خود پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس کی تعریف کی بالکل بے اختیار ہی‘ وہ اچھی بھی تو اتنی لگ رہی تھی‘ میری تعریف پر وہ سرخ ہو گئی تھی۔ ڈھیر سارے رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے اور میں حیران سا اسے

دیکھ رہا تھا۔

وہ کتنی مکمل' کتنی پُروقار لگی تھی۔ اس کا اصل حسن تو اس کی شرم و حیا تھی اور اسی حسن نے میرے دل کو اپنے مدار میں گھومنے پر مجبور کر دیا تھا عورت میں شرم و حیا نہ ہو تو شاید اس میں کوئی حسن ہی نہیں' کوئی دلکشی ہی نہیں ہوتی۔

☼ ☼ ☼

اس دن مجھے ناشتے کی ٹیبل پر اچانک ملازموں پر غصہ آ گیا تھا جب میں ان پر غصہ ہو رہا تھا تو اچانک دیوار پر لگے ہوئے شیشے میں میں نے انا کو دیکھا۔ شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں' اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر اس کا استقبال کرتا' کسی اجنبی احساس نے میری چھٹی حِس کو چونکا دیا تھا۔

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی' مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ وہاں کیوں رک گئی تھی۔ آگے کیوں نہیں بڑھ رہی تھی اور تب مجھے وہ چیز نظر آ گئی جس کی طرف میری چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی' وہ اس کا تیزی سے زرد ہوتا ہوا چہرہ تھا۔

"مگر کیوں.....؟" ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ وہاں کیوں رکی تھی۔ وہ مجھ سے اور میرے غصے سے خوفزدہ تھی' مجھے اپنی سوچ کی تصدیق کرنے میں لمحہ لگا تھا۔ جب میں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی پلیٹ زور سے زمین پر پٹخی تھی اور آئینے میں میں نے واضح طور پر اس کے جسم کو جھٹکا لگتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اور تب میں نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

مجھے لگا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے زمین پر گر جائے گی میں اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا تھا' لیکن وہ پلٹ گئی تھی' میں نے اسے پکارا بھی مگر وہ رکی نہیں۔

میری اس بات کی تصدیق تو ہو گئی تھی کہ وہ میرے غصے سے خائف تھی لیکن اس تصدیق سے میرا ایک نقصان ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے بدظن اور بدگمان ہو چکی تھی۔ وہ میری کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھی۔ وہ میرا فون تک نہیں سنتی تھی۔ دل کی پہلی منزل پر ہی میں ہار رہا تھا لیکن میں ہارنا نہیں چاہتا تھا میں نے انا کی رخصتی پر زور دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر انا رخصت ہو کر میرے گھر آ گئی۔ کتنی ڈھیر ساری باتیں تھیں' جو اس کے لیے سوچ رکھی تھیں جو صرف اس کے لیے ہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اس نئے رشتے کا احساس اسے اس کیفیت سے نکال چکا ہو گا لیکن میں غلط تھا۔ وہ اب بھی اسی لمحے کے زیرِ اثر تھی۔ وہ مجھ سے اتنی خوفزدہ ہو گی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی اور جب میں اس کے پاس گیا تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کے ہوش ربا حسن پر نظر ڈالتے ہوئے میں گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ مجھ سے خوف میں مبتلا تھی' لیکن کیوں؟ کیا صرف میرے غصے کی وجہ سے؟ لیکن غصہ تو ہر انسان میں موجود ہوتا ہے' کیا محض کسی کے غصے سے اتنا خوفزدہ ہوا جا سکتا ہے جتنا وہ مجھ سے تھی۔ یقیناً نہیں......

اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مکمل طور پر نارمل نہیں تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھی اور اس کی اس ڈسٹربنس کو صرف پیار سے دور کیا جا سکتا تھا۔ میں اسے عام انسانوں کی طرح ٹریٹ نہیں کر سکتا تھا' میں نے اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کا احساس نہیں دلایا تھا بلکہ پہلے میں اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔

میرے اس فیصلے نے میرے ضبط کا بہت امتحان لیا تھا۔ وہ میری دسترس میں تو تھی مگر میں اسے اس کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا تھا' میری موجودگی ہی اس کے اعصاب کے لیے کڑا امتحان بن جاتی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپتے رہتے' بات کرتے کرتے وہ خاموش ہو جاتی' ہنستے ہنستے رک جاتی' وہ شدید تنہائی کا شکار تھی اور اس میں اس کی اس تنہائی کو غیر محسوس طریقے سے دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں اسے اپنے فارم

ہاؤس پر لے گیا تھا۔

وہاں بھی اس خوف نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا' وہیں مجھے یہ احساس ہوا' درحقیقت وہ مجھ سے نہیں میرے غصے سے خوفزدہ تھی' میری کوشش رنگ لا رہی تھی لیکن جب بھی مجھے لگتا کہ میرے دل کی منزل قریب آ گئی ہے' جب بھی مجھے لگتا کہ میری کوششیں رنگ لا رہی ہیں' اچانک وہ شخص 'اسفندیار آفندی' میرے اور انا کے درمیان آ کر کھڑا ہو جاتا اور میرا سفر پھر سے اپنے نقطۂ آغاز سے دوبارہ شروع ہو جاتا۔ میری مجبوری تھی کہ میں انا کو اس شخص کا اصل چہرہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ وہ کبھی بھی میرا یقین نہ کرتی۔

کبھی کبھی اچانک میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی کہ جس کے بارے میں مجھے پہلے ہی سے علم ہوتا تو وہ حیرت سے پوچھتی تھی' آپ کو کیسے پتہ چلا پھر میں اسے ٹال دیا کرتا تھا۔ اس کی سالگرہ کا دن بھی مجھے یاد تھا لیکن شاید وہ یہ سمجھتی تھی کہ میں بے خبر ہوں۔ وہ صبح سے شام تک میں نے انا کے ساتھ گزارا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت معصوم تھی۔ شاید زین ٹھیک کہتا تھا اگر میں اس سے شادی نہ کر لیتا تو شاید وہ بھی اپنی معصومیت کی بھینٹ چڑھ جاتی۔

☼ ☼ ☼

اس دن مجھے انا کا ایک بہت خوبصورت اور مکمل طور پر بیویوں والا روپ دیکھنے کو ملا تھا۔ میرا ہاتھ کٹ گیا تھا اور وہ میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے نرم ہاتھوں میں تھامے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک پاکیزہ سچائی کا اثر میری روح تک میں اتر گیا تھا۔ میرا دل دعا کر رہا تھا کہ وقت وہیں کہیں ٹھہر جائے اور وہ ہمیشہ میرے سامنے اسی طرح دوزانو بیٹھی رہے' اس نے اپنا دوپٹہ بھی میرے ہاتھ پر باندھا تھا۔ میں بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ تکلیف اسے ہو رہی تھی۔ فکرمند' خوبصورت چہرہ' چھلک جانے کو بے تاب آنسو تھے اور میں تھا۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی پھر وہ آنسو رکے نہیں۔ پلکوں کی باڑ توڑ کر اس کے چہرے پر بکھر گئے اور ان بکھرتے ہوئے مقدس موتیوں نے مجھے بھی بکھیر کر رکھ دیا۔

مجھے ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا' مجھے محسوس ہوا تھا کہ ہر طرف موسم کی پہلی بارش رم جھم برس گئی تھی۔ اس دن میں بھی اس بارش میں بھیگ گیا تھا۔ اس سیلاب میں ہمیشہ کے لیے بہہ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"درد زیادہ ہو رہا ہے؟" میرا دل چاہا کہ میں کہوں۔ "نہیں' مجھے بہت سکون مل رہا ہے۔" لیکن میں کہہ نہ سکا۔

بس دعائیں مانگتا رہا ان لمحوں کے طویل ہونے کی اور ان کے ہمیشہ کے لیے ٹھہر جانے کی۔ سنا ہے برستی بارش میں جو بھی دعا کرو' قبول ہوتی ہے۔ اس دن میری دعا بھی قبول ہو گئی تھی۔ اس دن اس برستی ہوئی بارش میں میرے دل کی ہر دعا قبول ہو گئی تھی' وہ وقت ٹھہر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ مکمل طور پر بیویوں کے انداز میں ڈھل گئی تھی۔ وہ بالکل نارمل ہو چکی تھی۔ مجھے آفس کے لیے تیار کرنا' میرے کام کرنا' میرا خیال رکھنا' یہ سب کرتے ہوئے وہ میرے دل کے اور بھی قریب آ گئی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلے اور بھی کم ہو گئے تھے لیکن مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ آئندہ آنے والے دنوں میں یہ فاصلے ایک بار پھر بڑھ جانے والے تھے۔

اس دن بالکل عام سے موضوع سے ہماری گفتگو شروع ہوئی تھی لیکن وہ ایک الگ ہی رنگ لے رہی تھی۔ میرے اور اس کے ذکر سے بات اسفندیار آفندی تک جا رکی تھی اور انا' وہ بھی تو وہیں رکی ہوئی تھی۔ وہ اب تک وہیں تھی' اس شخص کو ابھی تک اسی سنگھاسن پر سجائے ہوئے اور میں؟ میں کہاں تھا؟ اس کی گفتگو' اس کی سوچ میں' میں کہاں تھا؟ اگر میں کچھ

دیر اور انتظار کرتا تو شاید وہ کہہ دیتی کہ "مجھے اپنے بابا دنیا کے ہر شخص سے زیادہ عزیز ہیں' تم سے بھی زیادہ۔" تو پھر میں کیا کرتا؟ میں اس کا جواب جانے بغیر ہی اٹھ گیا تھا۔

فطری طور پر مجھے دکھ ہوا تھا' کسی بھی عام مرد کی طرح میں بھی یہی چاہتا تھا کہ میری بیوی کے لیے دنیا کا سب سے اہم شخص صرف میں ہی ہوں لیکن انا کے لیے آج بھی وہ شخص ہر رشتے سے زیادہ اہم تھا۔ مجھے لگا کہ اگر میں سو سال بھی اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہوں پھر بھی وہ کہے گی۔ "سب سے پہلے بابا ہیں۔" میں اس سے ناراض ہو گیا تھا۔

مجھے یہ ناراضی اپنا حق لگی تھی لیکن یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی کہ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ ایک بار پھر اپنے ماضی میں لوٹ گئی۔ جس خوف سے میں اسے باہر نکال کر لایا تھا' وہ اسی خوف میں واپس چلی گئی تھی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ میری کوششیں' کئی مہینوں کی ریاضتیں' میری محبت سب رائیگاں گئی تھی۔ آخر ایسا کیا خوفناک سلوک کیا تھا میں نے انا کے ساتھ جسے بھولنے پر وہ تیار ہی نہیں تھی؟ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے تھا اور اس جواب کے لیے میں نے انا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن اس نے جو کہا تھا' وہ میری سماعتوں کے لیے ناقابل اعتبار ثابت ہو رہا تھا۔

وہ یہ کیا کہہ رہی تھی؟ اس کی نظر میں قصوروار میں تھا' صرف میں۔ اسے لگتا تھا کہ میں نے اسے دھوکا دیا تھا' اس کے نزدیک میں ہی معتوب تھا' میں ہی مجرم تھا اور وہ شخص جو حقیقتاً اس کے ساتھ دھوکا کرتا آیا تھا' وہ آج بھی پاک صاف تھا۔ اس ساری صورتحال کا ذمہ دار بھی وہ شخص تھا۔ میں نے اپنے اندر کا سارا غبار' سارا غصہ اس کے سامنے نکالا تھا۔ میں اسی شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر انا کی اس حالت کا ذمہ دار اسے قرار دیا تھا اور وہ گھٹیا شخص بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی مانتا اس نے کہا تھا۔

"وہ میری بیٹی ہے' مجھے حق تھا کہ میں جس طرح چاہتا اس کی پرورش کرتا' تم مجھ سے جواب طلبی کرنے والے کون ہو؟" مجھے غصہ آگیا تھا۔

"ہاں' تمہیں یہ حق حاصل تھا کہ تم جس طرح چاہتے اس کی پرورش کرتے' تم نے جو کرنا تھا کیا لیکن مائنڈ اٹ مسٹر اسفندیار آفندی! کہ اب وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں' اب وہ میری بیوی ہے۔ اب میں تمہیں مزید اس پر کوئی حق جمانے نہیں دوں گا۔" اور اس خودپسند شخص پر میری کسی بات کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

"مائنڈ یو مسٹر زیصل علی آفندی! وہ اب بھی میری بیٹی ہے' میرا اس پر حق نہ تم ختم کر سکتے ہو اور نہ ہی دنیا کی کوئی اور طاقت۔ شاید مجھ سے اس کے لیے تمہارا انتخاب کرنے میں بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے' تم اس قابل ہی نہیں تھے کہ میں انا کو تمہارے حوالے کرتا اور نہ تمہارا گھر اس قابل ہے کہ وہاں میری بیٹی رہ سکے۔ وہ تمہارے گھر میں اب اور نہیں رہے گی۔" وہ مجھے چیلنج دیتے ہوئے بولا تھا۔ ایک طنزیہ ہنسی میرے لبوں پر بکھری تھی۔

"وہ اب تمہاری بیٹی نہیں ہے مسٹر اسفندیار آفندی! جسے تم ڈرا کر' سہما کر اپنی بات منوا لیتے تھے' اب وہ زیصل علی آفندی کی بیوی ہے۔ میری مرضی کے بغیر وہ اس گھر کو کبھی نہیں چھوڑے گی اور نہ تمہارے پاس آئے گی۔" میں نے بھی بھرپور زعم سے اسے چیلنج کیا تھا۔ میرے چیلنج نے اسے بھڑکا دیا تھا۔

"اور میں کہتا ہوں کہ وہ آئے گی' وہ میرے پاس ضرور آئے گی۔" وہ بھی میرے ہی لہجے میں بولا تھا لیکن میں اسے نظرانداز کر کے آگیا تھا' راستے میں مجھے اس شخص کے بارے میں خیال آیا کہ وہ واقعی کچھ بھی کر سکتا ہے' اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے بارے میں انا کو کچھ بھی بتائے بغیر میں اسے ہمیشہ کے لیے امریکا لے جاؤں گا لیکن جب میں گھر آیا تو میں نے انا کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اتنی رات کو وہ کہاں جا رہی

تھی' اس سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بابا کے گھر جا رہی ہے۔ ہاں اس نے مجھے بتایا ہی تھا' مجھ سے اجازت نہیں لی تھی اور میں جو اس کے باپ کے سامنے بڑے بڑے دعوے کر کے آیا تھا کہ انا میری مرضی کے بغیر کہیں نہیں جائے گی' میرے سارے دعوے غلط ہو گئے تھے' وہ شخص جیت گیا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا' انا اس کی بیٹی تھی' کبھی تو اس نے میرے مقابلے میں اپنے باپ کے گھر کا انتخاب کیا تھا۔

میرا ضبط جواب دے گیا اور میں پھٹ پڑا تھا۔ میرا رہا سہا مان بھی انا نے توڑ دیا تھا اور میری اس شکست نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا' اس لمحے میں ہر مصلحت بھولتا چلا گیا تھا۔ میں جو سوچ کر آیا تھا کہ انا کو اسفندیار آفندی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا' میں اسے سب کچھ بتاتا چلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری باتیں سن کر وہ روئے گی لیکن وہ تو مسکرا رہی تھی' مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا' کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گئی تھی؟ لیکن نہیں' پاگل تو میں ہو گیا تھا۔ اس نے میری کسی بات پر یقین ہی نہیں کیا تھا۔

میں اسے یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ اسفندیار آفندی اسے ایک چیز سمجھ کر استعمال کیا تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ میں اسے اپنی جاگیر سمجھتا رہا ہوں۔ پتا نہیں ہم میں سے کون درست کہہ رہا تھا اور کون غلط لیکن اس نے اپنی زندگی کے محاذ پر میں بری طرح ہار چکا تھا' پسپا ہو رہا تھا اور میں جو سوچتا تھا کہ میں انا کو روک لوں گا' اسے جانے نہیں دوں گا' کچھ بھی نہیں کر سکا تھا میں اسے روک نہیں سکا تھا اور انا دور ہوتی چلی گئی' میری زندگی سے دور۔

وہ ٹھیک کہتی تھی' میں نے بھی اس کے لیے اس کے باپ جیسا رول ادا کیا تھا' پتا نہیں میں نے بھی اسے اپنی جاگیر سمجھ کر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا' میں دنیا کا سب سے بے وقوف شخص تھا جو یہ چاہتا تھا کہ انا صرف میری ہو کر رہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا میں ہر رشتے کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے' کسی نئے رشتے کے مل جانے سے پرانے رشتے ختم نہیں ہو جاتے۔ وہ اپنے بابا پر اندھا دھند اعتماد کرتی تھی پھر بھی میں نے اسے اس کے بارے میں سچ بتانے کی غلطی کی۔

اس کی برسوں پرانی محبت اور عقیدت کے سامنے میری ساری محبتیں ہار گئی تھیں۔ اس کا انتخاب وہی شخص ہو سکتا تھا۔

اس کی طرف سے میرے نام آخری پیغام "خلع کا نوٹس۔" میرا موت نامہ میرے سامنے پڑا میرے دستخط کا منتظر ہے۔ صرف میرے دستخط کا جس کے بعد انا ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل جائے گی' باضابطہ طور پر اور میں بے سائس ہو جاؤں گا' مردہ ہو جاؤں گا' باضابطہ طور پر۔

☼ ☼ ☼

ابھی ابھی زیصل میرے پاس آیا تھا' کتنا ٹوٹا ہوا' کتنا بکھرا ہوا' کیا یہ وہی شخص تھا جس سے میں اپنی انا کو بچانا چاہتا تھا؟ کیا یہ وہی زیصل تھا جو اس دن بھرپور زعم میں پورے دعوے کے ساتھ مجھ سے لڑ کر گیا تھا؟ یہ وہی زیصل تھا ناں؟ یہ کیا ہوا اسے؟ یہ اتنا بجھا بجھا سا کیوں تھا؟ وہ تو کہتا تھا۔ "انا میری ہے۔" پھر وہ خود ہی اس سے دستبردار کیوں ہو رہا تھا؟ اس نے کہا ہے' وہ انا کو چھوڑ دے گا اور میں بھی تو یہی چاہتا تھا پھر اب مجھے خوشی کیوں نہیں ہو رہی؟

زیصل کہہ رہا تھا کہ وہ ہار گیا ہے اور میں جیت گیا تھا۔ نہیں' ہارا وہ نہیں تھا' ہار تو میں گیا تھا وہ تو جیت گیا تھا یا شاید ہم میں سے کوئی نہیں ہارا تھا' ہم دونوں ہی جیت چکے تھے۔ ہماری جیت تو تقدیر کے صفحوں پر لکھی جا چکی تھی' کسی نے ہماری جیت لکھ دی تھی' اپنے معصوم بے گناہ لہو سے۔ ہاں ہم دونوں جیت گئے تھے اور کوئی چپکے سے ہار گیا تھا۔ انا آفندی' میری پیاری' میری لاڈلی بیٹی جو چپکے سے اپنی ہار کے بدلے ہماری جیت لکھ گئی تھی' اس سارے پار جیت کے کھیل میں ہار صرف انا کے حصے میں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جب سے زیصل یہاں سے گیا ہے جانے کیوں مجھے

"گوری" بہت یاد آرہی ہے۔ گوری، میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت۔ جس نے پہلی ہی نظر میں مجھ سے میرا شعور، میرا رتبہ اور میرا دل چھین لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ میری زندگی کا پہلا سوال تھی، پہلی خواہش لیکن یہ بھی سچ ہے کہ گزشتہ چوتھائی صدی میں میں نے اسے صرف ایک سوال اور ایک جملے جتنا ہی سوچا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میرے اور اس کے تعلق میں حقیقت ہی صرف یہ سوال اور یہ جملہ تھا جسے میں گزشتہ پچیس برسوں سے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس نے یہ جملہ کیوں کہا تھا۔ اس کی باتوں کو ہزار رنگ میں سوچا ہے، ہزار زاویے سے دیکھا ہے اور آج میں پوری طرح اس ایک جملے کا مفہوم سمجھ پایا ہوں۔

☼ ☼ ☼

گوری سے میں نے شادی کی تھی لیکن بابا جان سے چھپ کر کیونکہ اس وقت مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں ان کے مزارع کی بیٹی کو ان کی بہو کی صورت میں حویلی کی دہلیز کے پار لے جاتا۔ گوری بہت خوبصورت تھی۔ بے حد بے حساب، تعریف، لفظ، زبان و بیان اور حسن سے بھی آگے۔ ایک کمزور سی لڑکی جسے میری طرح یہ دعویٰ تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میرا دعویٰ صرف خالی خولی دعویٰ ہی تھا اور وہ مجھ سے محبت کرتی تھی بلکہ محبت نہیں، وہ مجھ سے عقیدت رکھتی تھی۔

سکندر آغا کو میری اور گوری کی شادی کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ ثبوت کے ساتھ یہ بات بابا جان تک پہنچاتے، میں نے بزدلوں کی طرح گوری کو اپنی زندگی سے نکال دیا اور اس لمحے مجھے محبت اور عقیدت کا مفہوم، اس کا فرق سمجھ میں آیا۔ وہ واقعی مجھ سے عقیدت رکھتی تھی، اتنی عقیدت کہ جب میں نے اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کا فیصلہ سنایا تو تب بھی اس نے بغیر چیخے چلائے، بغیر مجھے برا بھلا کہے، بغیر کوئی احتجاج کیے چپ چاپ میرا فیصلہ مان لیا۔ حالانکہ میرے اس فیصلے نے جو دکھ اسے دیا تھا وہ اس کی آنکھوں میں چھلکنے کو بے تاب پانی میں ہلکورے لیتا ہوا صاف نظر آرہا تھا لیکن اس نے میرے اس فیصلے پر احتجاج نہیں کیا۔

ہاں اس نے مجھ سے ایک سوال کیا۔ "سائیں! محبت عزت اور رتبے سے چھوٹی ہوتی ہے؟" اس سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا اور پھر اس نے اپنے ٹوٹے، بکھرے لہجے میں مجھ سے وہ آخری بات کہی جس کا مفہوم سمجھنے میں مجھے پچیس سال لگ گئے۔

اس نے کہا تھا۔

"اللہ کرے سائیں! آپ کے گھر میں ایک بیٹی ضرور پیدا ہو۔" اور پھر وہ شکستہ قدموں سے واپس لوٹ گئی۔

پتا نہیں یہ دعا تھی یا بددعا۔

کیا کوئی شخص دکھ کی انتہا پر پہنچ کر دکھ پہنچانے والے کو دعا دے سکتا ہے؟ کبھی نہیں اور جب گاؤں کے کنویں سے گوری کی لاش ملی تو مجھے مکمل طور پر یقین ہو گیا تھا کہ وہ گوری کی میرے لیے آخری بددعا تھی۔

گوری سے میری آخری ملاقات کے آخری لمحے سے ہی میں اس بددعا کے زیر اثر آگیا تھا۔ اس طاقت ور بددعا کے گہرے سائے کے اثر میں اکثر میں راتوں کو ڈر کر اٹھ جاتا۔ گوری کا بے جان چہرہ میری نگاہوں کے سامنے پھرتا اور میں رو رو کر اللہ سے دعا کرتا کہ میرے گھر میں بیٹی پیدا نہ ہو۔ اسی کشمکش کے دور میں میں نے بابا جان کی پسند کے آگے سر جھکا دیا۔

وہ ایک عام سی شکل کی عورت تھی جو کسی بھی لحاظ سے گوری کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دبی دبائی سی غلام روح والی عورت تھی جسے غلامی کرنے کی عادت پڑ چکی تھی اور اگر کوئی اسے آزادی دینے کی کوشش بھی کرتا تو وہ خود زنجیریں طلب کرنے لگتی۔

میں نے بہت دعائیں کیں لیکن میری دعائیں قبول نہ ہو سکیں، وہ آگئی تھی، مجھے جھکانے، مجھے ہرانے، ایک لمحے نے میرا وجود بالکل کمزور کر دیا، میرا

دل نہیں چاہتا تھا کہ میں ایک نظر بھی اسے دیکھوں۔ پورا ایک ہفتہ میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی اور پھر ساتویں دن میں نے اسے دیکھا۔ پتا نہیں کیا تھا اس بچی میں، میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔

وہ بہت پیاری سی تھی، لال سرخ گالوں والی، روئی کے گالوں کی طرح نرم و نازک، میرا دل چاہا کہ میں اس کا ماتھا چوموں، میں نے اپنا چہرہ، اپنے لب اس کے ماتھے کی طرف بڑھائے لیکن میں اسے چوم نہ سکا۔ اچانک گوری میرے سامنے آگئی تھی، اس کی بددعا میرا رستہ کاٹ چکی تھی، میں نے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ آخر کار وہ آہی گئی تھی، میری بہت سی دعاؤں کے باوجود بھی۔ وہ میری مرضی کے بغیر آگئی تھی، مجھے ہرانے، مجھے جھکانے، مجھے ختم کرنے، مجھے گوری کی بددعا لگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں نے انا کے وجود کو تو تسلیم کر لیا تھا لیکن پھر بھی میں اس سے بھاگتا رہتا تھا۔ مہینوں مہینوں پلٹ کر اس کی خبر نہیں لیتا تھا، میں نے کبھی اسے گود میں نہیں اٹھایا تھا، یوں بھی وہ بہت چھوٹی تھی، شاید وہ خود میرے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ مہینوں تک حویلی سے دور رہ کر بھی مجھے حویلی یا وہاں کے کسی فرد کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، وہاں کسی کو میری ضرورت نہیں ہوتی تھی، کسی کو میرا انتظار نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس حویلی میں کبھی کسی کو اپنا منتظر نہیں دیکھا تھا لیکن پھر ایک دن میری بچی نے مجھے معتبر کر دیا، اس نے میرا انتظار کرنا شروع کر دیا۔

میں نے اس تین سال کی بچی کو اپنا انتظار کرتے ہوئے محسوس کیا، اس سے اتنا دور دور رہنے کے باوجود میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لوٹ آنے کی آس دیکھی تھی جو وہاں کسی اور کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

اس دن میں نے حویلی کی دہلیز پار کی تو جانے کس کونے سے اچانک سنہری بالوں، گلابی چہرے والی ایک چھوٹی سی بچی میرے سامنے آگئی، وہ انا تھی، وہ دور سے ستون کے پیچھے چھپ کر کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی اور پھر اچھلتی ہوئی اپنی چہکتی ہوئی آواز میں بولتی ہوئی اندر کی طرف بھاگی۔

"بابا آگئے، بابا آگئے۔" خوشی سے اس کی آواز چہک رہی تھی۔

میں حیران تھا کہ وہ مجھے نہ صرف پہچانتی تھی بلکہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں اسے اپنی گود میں نہیں اٹھاؤں گا، اسی لیے وہ دور سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ میری ساری توجہ اس کی طرف مرکوز ہو گئی تھی، یقیناً" وہ بہت پیاری بچی تھی، اس کی اس حرکت نے میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ میں نے اسے دیکھا وہ اسی طرح اچھلتی ہوئی اندر کی طرف جا رہی تھی، جب اچانک گر گئی۔

میں تڑپ کر اس کی طرف بڑھا تھا، وہ وہیں بیٹھی رو رہی تھی، میں اس کے پاس گیا تو بھی اس کے رونے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی، خون بھی بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا زخم صاف کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کروانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اسے اپنی جیب سے وہ چاکلیٹ نکال کر دیے تھے جو میں زین کے لیے لایا تھا، اب وہ خاموش ہو گئی تھی لیکن اب بھی سسک رہی تھی، میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے نرم چہرے سے آنسو پونچھے تھے، اس دن تین سال کے بعد دوسری بار میں اسے اپنی گود میں اٹھا کر حویلی کے اندر لے کر گیا تھا، اس کے ساتھ گزرے ہوئے دوسرے لمحے نے دوسری بار میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ پہلی بار جب وہ پیدا ہوئی تھی تو میں نے حویلی کے دو حصے کروا دیے تھے۔

میں چاہتا تھا کہ گوری کی بددعا دعا میں تبدیل ہو جائے، اسی لیے میں کسی اور کا سایہ بھی اس پر پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے میرے لیے بددعا نہ بنا سکے اور اس لمحے اس کے ساتھ گزرے ہوئے دوسرے لمحے نے بھی کسی چیز کو دو حصوں میں تقسیم کیا

تھا وہ چیز میرا وجود تھا جس کے دو حصے ہو گئے تھے' ایک حصہ اسفندیار آفندی کے نام کا تھا اور دوسرا حصہ ایک باپ کا تھا۔

☼ ☼ ☼

میرا حویلی آنا انا کی آنکھوں میں روشنیاں سی بھر دیتا تھا اور میرے جانے سے ان آنکھوں کی جوت بجھ سی جاتی۔ اس دن میں حویلی سے واپس جا رہا تھا' میں نے ملازمہ کو اپنے جوتے لانے کے لیے کہا تھا' آہٹ کی آواز پر میں سمجھا کہ شاید ملازمہ ہے لیکن میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے شدید حیرت ہوئی' وہ انا تھی۔ اس تین سال کی بچی نے میرے بھاری جوتے بمشکل سنبھالے ہوئے تھے' وہ اچھی طرح چل بھی نہیں پا رہی تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی میرے سامنے آ رکی تھی اور جوتے میرے سامنے رکھ دیے۔

"پاپا! آپ کے جوتے۔" وہ اپنی معصوم سی آواز میں آنکھوں میں معصومیت بھر کر بولی تھی۔

"یہ کیا کیا تھا اس نے' اس نے میرے جوتے کیوں اٹھائے تھے؟" میں نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا کر اس کا منہ چوما اور اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

میری اس قدر توجہ پا کر وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی لیکن میں اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دے سکا تھا' میں ہنس نہیں سکا تھا بلکہ اس دن میں بہت رویا تھا' بہت زیادہ۔ زندگی میں پہلی بار مجھ جیسا مضبوط' انا پرست' خود پسند شخص ٹوٹ کر شدت سے رویا تھا۔ میرا دل چاہا میں انا کو ساری دنیا سے چھپا لوں لیکن اس لمحے میں نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا تھا۔

تب مجھے احساس ہوا تھا کہ لوگ بیٹی کے پیدا ہونے پر روتے کیوں ہیں' کیوں بیٹیوں کو بددعا سمجھا جاتا ہے۔

اس دن میرے وجود کے دونوں حصے یکجا ہو گئے۔ اسفندیار آفندی کہیں پس منظر میں چلا گیا' وہاں ایک نیا شخص کھڑا تھا۔ وہ شخص جو ابھی ابھی وجود میں آیا تھا' ایک باپ' سر سے پیر تک ایک باپ۔

☼ ☼ ☼

پھر میں جو مہینوں تک حویلی کی خبر نہیں لیتا تھا' ہر ہفتے حویلی آنے لگا تھا' اپنی بیٹی کی خاطر۔ میری بیٹی نے مجھے وہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلے میں حویلی واپس آتا بھی تھا تو روٹین کے کسی کام کی طرح لیکن اب مجھے حویلی آنے کا انتظار رہنے لگا تھا۔ میں انا سے ملنے کے لیے' اس کی شرارتوں کے لیے ترستا رہتا تھا۔ میں اندر ہی اندر بدل رہا تھا' اپنی بیٹی کے لیے میں بدل رہا تھا۔ کتنی طاقت ور ہوتی ہے یہ بیٹی کی ذات' یہ بن کے خاموشی سے بغیر بتائے انسان کی ذات کو اندر ہی اندر بدل دیتی ہے۔ انسان کو پتا ہی نہیں چلتا۔ اس کی ذات ختم ہو جاتی ہے اور وہ صرف ایک باپ بن کر رہ جاتا ہے۔

میں نہ صرف خود بدل گیا تھا بلکہ میں انا کے لیے بھی بہت کچھ بدل رہا تھا۔ میں اس کے لیے وہ سارے اصول توڑنا چاہتا تھا جو میرے خاندان میں صدیوں سے رائج تھے' چاہے وہ سب کسی کو پسند آتے یا نہیں اور سب سے پہلے میں نے انا کے لیے اس حویلی کو توڑا اور یہ وہ پہلی چیز تھی جو میں نے انا کے لیے توڑی اور ایسا بہت کچھ تھا جسے توڑنے کی مجھے ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ دنیا کا کوئی شخص انا کے ساتھ زیادتی نہ کر سکے' میں نے محسوس کیا تھا زینب زین کو زیادہ پیار کرتی تھی اور انا اسے احساس محرومی سے دیکھتی رہتی تھی۔ تب میں نے اسے بھی دو ٹوک الفاظ میں سمجھایا تھا کہ انا اس کے لیے زین سے زیادہ اہم ہونی چاہیے اور میری بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ بھی اسی ماحول کا حصہ تھی' سب لوگوں کی طرح اس نے بھی انا کو مری بھیجنے کے فیصلے سے اختلاف کیا تھا لیکن اس دن کے بعد اس نے اپنا رویہ بہت تبدیل کر لیا تھا' یہ چیز میرے لیے اطمینان کا باعث تھی لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر تک مجھے نصیب نہیں ہو سکا تھا اور زینب فوت ہو گئی۔

اس دن کے بعد میں نے انا اور زین کے لیے باپ کے ساتھ ساتھ ان کی ماں کی جگہ بھی سنبھال لی اور پھر میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ میں کون ہوں' کیا ہوں؟ زینب کی وفات کے بعد سب کچھ ایک طے شدہ سانچے میں ڈھل گیا اور میں انا کو خود سے دور بھیج کر اسے مضبوط بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بہت کمزور سی لڑکی تھی' اسے اپنا حق لینا نہیں آتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ اپنا حق چھین سکے لیکن شاید وراثت میں اس نے اپنی ماں سے اس کی غلام فطرت حاصل کر لی تھی۔

انا نے مجھے باقی ساری دنیا سے بیگانہ کر رکھا تھا' وہ بچی جسے میں نے پہلے دن دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا' وہی میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بن چکی تھی۔ وہ خود بھی تو کتنی پیاری تھی' وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھی۔ میں اس سے جو کہتا تھا وہ مان لیتی تھی' اس نے کبھی میرے کسی فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔

وہ میرے ساتھ جتنا وقت بھی گزارتی' اسے ہر وقت میری فکر لگی رہتی' وہ میرا اتنا خیال رکھتی تھی جتنا کوئی زندگی' اپنی سانسوں کا رکھتا ہے۔ میں اگر بیمار پڑ جاتا تو وہ اداس اداس' بولائی بولائی سی سارے گھر میں پھرتی' بات بات پر اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور وہ پل بھر کے لیے بھی مجھے اکیلا نہ چھوڑتی۔ تب اکثر مجھے ایک نظم یاد آیا کرتی تھی جو میں نے جانے کب پڑھی تھی۔

بیٹیاں زمیں پر آنسوؤں کے پیار کی صورت ہوتی ہیں
رحمتوں کی صورت ہوتی ہیں
بیٹیاں خوبصورت ہوتی ہیں
دل کے زخم مٹانے کو
آنگن میں اتری بوندوں کی طرح ہوتی ہیں
بیٹیاں پھولوں کی طرح ہوتی ہیں
بیٹیاں دھوپ میں سایہ دیتی نرم ہتھیلیوں کی
طرح ہوتی ہیں
بیٹیاں تتلیوں کی طرح ہوتی ہیں
پریوں کی طرح ہوتی ہیں
تنہا اداس سفر میں رنگ بھرتی
رداؤں جیسی ہوتی ہیں
بیٹیاں چھاؤں جیسی ہوتی ہیں
کبھی بلا سکیں' کبھی چھپا سکیں
بیٹیاں ان کہی صداؤں جیسی ہوتی ہیں
کبھی جھکا سکیں' کبھی مٹا سکیں
بیٹیاں اناؤں جیسی ہوتی ہیں
کبھی ہنسا سکیں' کبھی رلا سکیں
کبھی سنوار سکیں' کبھی اجاڑ سکیں
بیٹیاں تو تعبیر مانگتی دعاؤں جیسی ہوتی ہیں
حد سے مہرباں' بیان سے اچھی
بیٹیاں وفاؤں جیسی ہوتی ہیں

انا بھی میرے لیے ایسی ہی تھی' اتنی ہی عزیز' انا کی ذات نے مجھے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہ دیا۔ مجھے پتا نہیں چلا کب زین بڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی بیٹے اور بیٹی میں فرق روا نہیں رکھا تھا لیکن مجھے علم ہی نہ ہو سکا کہ انا کے لیے لڑتے لڑتے کب میں نے زین کو نظر انداز کر دیا۔

عموماً" بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے لیکن میرے گھر میں میں نے اپنی بیٹی کے مقابلے میں اپنے بیٹے سے زیادتی کی تھی۔ میں نے اپنی بیٹی کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ اہمیت دی تھی۔ زین میری عدم توجہی کا شکار ہو چکا تھا۔

سونے پر سہاگا بابا کی قربت نے کیا۔ وہ بابا سے بہت محبت کرتا تھا۔ بابا سے میرے اختلاف کو اس نے میری زیادتی سمجھا۔ اس کی نظر میں میں جتنا برا باپ تھا' اتنا ہی برا بیٹا رہی سہی کسر گاؤں میں پوری ہو گئی۔ وہ بابا کے ساتھ زمینوں پر جاتا تھا۔ وہاں لوگوں کی زبانی اسے گوری کے قصے کا پتا چلا۔ گوری کی خوبصورتی' اس کی جوان موت آسانی سے بھلائی جانے والی نہ تھی۔ دبے لفظوں میں لوگ میرا نام بھی لیتے تھے۔ زین کی نظر میں میں نہ اچھا باپ تھا' نہ اچھا بیٹا اور نہ ہی اچھا انسان وہ مجھ سے دور تو پہلے ہی تھا۔ اب نفرت کرنے لگا تھا۔

میں اس کی بدگمانی دور کرنا چاہتا تھا لیکن وہ میری

کوئی بات سننے پر تیار ہی نہ ہوا' اسے مجھ سے ان گنت شکایتیں تھیں۔ حتیٰ کہ وہ میرے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتا تھا' اس کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے امریکہ جانا ہے۔ وہ بھی میری ہی طرح ضدی تھا' وہ کسی کی روکنے پر نہیں رکا تھا۔ وہ مجھے اور انا کو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے اکیلا چھوڑ گیا تھا اور انا کے لیے بھی تو مجھے ہی لڑنا تھا' اسے دنیا کے ہر سرد گرم سے بچانا تھا۔

☼ ☼ ☼

زین کے جانے سے میری مشکلات بڑھ گئی تھیں' جوان بیٹے کی جدائی نے مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کردیا تھا۔ میرا بزنس ڈوب رہا تھا' ہماری کمپنی کے کچھ اہم آرڈرز عین وقت پر کینسل ہوگئے تھے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا تھا کہ ہمیں مزید آرڈر ملنا بند ہوگئے تھے پھر ایک دن اچانک ایک اسٹیبلش انٹرنیشنل کمپنی نے ہمارے ساتھ ایک ڈیل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اتنی بڑی کمپنی کا ہماری کمپنی کے ساتھ اس وقت بزنس کرنا جب وہ بالکل ڈوب رہی تھی' انتہائی حیران کن تھا۔

اسی سلسلے میں مجھے اس کمپنی کے ڈائریکٹر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پچاس' ساٹھ سال کا کوئی تجربہ کار شخص ہوگا' وہ تو اٹھائیس' انتیس سال کا ایک خوش شکل اور خوش لباس انسان تھا' پہلی ملاقات میں ہی مجھے اس کی ذہانت اور گفتگو نے متاثر کیا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد جس طرح وہ ان کی کمپنی کو عروج پر لے کر گیا تھا' وہ واقعی قابل تعریف تھا۔ میں زندگی میں بہت کم لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں لیکن اس سے ہونے والی چند ملاقاتوں نے ہی مجھے یہ اعتراف کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ اس میں متاثر کرنے والی کوئی بات تھی' اس کا انداز گفتگو' اس کا اخلاق وہ سب مجھے اس کے ساتھ ایک اپنائیت کا احساس دلاتا تھا لیکن ایک دن ایک جھٹکے میں ہی اس نے اپنائیت کا وہ احساس ختم کردیا' جب اس نے انا کو پرپوز کیا۔

وہ انا کو کیسے جانتا تھا اور اس نے اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیوں کیا تھا؟ یہ سب جاننے کی مجھے میرے غصے نے مہلت ہی نہیں دی تھی' وراثت میں حاصل کیا ہوا میرا جاگیردارانہ خون کھول اٹھا تھا' اسے جرات کیسے ہوئی کہ وہ انا کو پرپوز کرتا؟ ہرا ایرا غیرا منہ اٹھا کر انا کو پرپوز کرسکتا ہے؟ کچھ بھی جانے بغیر' کچھ بھی کہے بغیر' میں نے دو لفظوں میں اسے انکار کردیا۔ اس کی کمپنی کے ساتھ ہماری ساری ڈیلز بھی ختم ہوگئیں جس کا نقصان صرف ہمیں ہوا لیکن مجھے اس نقصان کی پروا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

میں اس واقعے کو بھول چکا تھا' جب ایک شام سکندر آغا خود چل کر میرے گھر آئے' اتنے دنوں' اتنے سالوں بعد اپنے کسی رشتے سے ملنا' اسے واپس پانا ان حالات میں مجھے اور بھی اچھا لگا تھا۔ جب میں خود بہت اکیلا محسوس کرتا تھا لیکن جاتے جاتے وہ میرے زخموں کو ادھیڑ گئے' جب انہوں نے مجھے میرے الفاظ یاد دلائے انا کے لیے۔ ایک لمحے کے لیے' ایک جذباتی لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ وہ پرپوزل قبول کرلوں' اتنے برسوں کے بعد ملنے والے اپنے بھائی کو واپس نہ جانے دوں مجھے سہارے کی ضرورت تب وہ بھی مجھے سہارا دے سکتے تھے لیکن پھر مجھے خیال آیا' جس ماحول سے اسے بچانے کے لیے میں سب کچھ کھو چکا تھا' داؤ پر لگا چکا تھا' اب میں اسے گھٹے ہوئے ماحول میں دوبارہ بھیج دیتا' ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ میں نے سکندر آغا کو انکار کردیا۔ انہیں اپنے در سے خالی ہاتھ لوٹا دیا' ان کو انکار کرکے پس پردہ میں ان سے گوری کا انتقام بھی لیا تھا۔ وہی تو تھے جن کی وجہ سے گوری مجھ سے دور ہوئی تھی' میں نے انہیں ہرا دیا تھا اور ہار کے صدمے نے انہیں تلملا کر رکھ دیا تھا۔

"کیا کروگے اسے اتنا پڑھا کر' بہت شوق ہے تمہیں اسے پڑھانے کا' ارے کون لے گا تمہاری خود سر شخص کی آزاد خیال پڑھی لکھی لڑکی کو۔ یہ تو میں ہی تھا جو اپنا سمجھ کر اپنے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگ رہا تھا' باقی خاندان تو اس پر تھوکے گا بھی نہیں پھر رہنا اپنی لاڈلی کی ڈگریوں کو سنبھالے۔" غصے میں تیز بولتے وہ اپنی جاہلانہ سوچ کا خوب مظاہرہ کررہے تھے۔

"میری بیٹی اس خاندان میں جائے گی بھی نہیں۔" میں نے انہیں صاف جتایا تھا اور میری بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"اچھا تو کیا کروگے؟ غیروں میں بیاہوگے اسے۔ ایسا ہی کرنا' تب ہی تمہیں پتا چلے گا کہ اپنے اور غیروں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ اپنا مارے بھی ہے تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔"

مجھے ان کی باتوں پر سخت تاؤ آیا تھا۔ وہ کیا سمجھتے تھے۔ میری بیٹی ان کے خاندان یا ان کے بیٹوں کے سہارے بیٹھی ہے۔

"آپ کیا سارا زمانہ دیکھے گا اسفندیار آفندی کے لیے ایسا شخص ڈھونڈوں گا میں جو ہر لحاظ سے بے مثال ہوگا۔"

"تم ہی ڈھونڈو گے یا یہ کام بھی تمہاری بیٹی ہی کرے گی۔"

انہوں نے نہایت گھٹیا بات کہی تھی' میرا ضبط جواب دے گیا اور میں نے انہیں اپنے گھر سے نکل جانے کا کہا۔

☼ ☼ ☼

میں نے سکندر آغا کو تو اپنے گھر سے نکال دیا تھا لیکن ان کی باتیں اپنے دماغ سے نہیں نکال سکا۔ ان کی باتوں پر لاکھ غصے کے باوجود بھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ ان کی باتیں اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ اب تک میں نے صرف انا کی تعلیم کے بارے میں سوچا تھا۔ صرف اسے ڈاکٹر بنانے کا سوچتا تھا۔ ڈاکٹر بننے میں اور کتنے سال لگ جاتے اور اس دوران اگر مجھے کچھ ہوجاتا تو اس کا کیا ہوتا' کیا زین اس سے وہ سلوک کرتا جو میں چاہتا تھا' یقیناً' نہیں' اسی لیے میں نے اپنی اور انا کی اس خواہش کو اپنے ہاتھوں سے توڑا تھا۔

میں نے انا سے کہا تھا کہ وہ میڈیکل لائن چھوڑ دے' میں نے صرف اپنی خواہش کا اظہار اس کے سامنے کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ کبھی میری بات نہیں مانے گی' وہ اختلاف کرے گی اور انکار کردے گی' یہ اس کا بچپن کا خواب تھا۔

میں اس کا انکار سننے کا منتظر تھا جب اچانک اس نے ہاں کہہ دی اور اس ایک ہاں نے اس کی خوابوں کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں چبھو ڈالی تھیں۔

وہ اپنے پہلے خواب سے دستبردار ہوگئی تھی۔ اپنی مرضی سے نہیں' میری مرضی سے۔ اس لمحے وہ مجھے بہت پیاری لگی تھی اور میرے دل کے در و دیوار نے' میرے اردگرد موجود ہر چیز نے جھک کر مجھ سے سوال کیا' وہی سوال ایک بار پھر کیا۔

"کیا تمہیں اتنی پیاری بیٹی بددعا لگتی ہے؟"

میرا جواب نفی میں تھا ہمیشہ کی طرح۔

♥ ♡ ♥

اس کے بعد دوسرا فیصلہ میں نے اس کی شادی کا کیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ انا کی شادی میرے خاندان میں نہیں ہوگی تو پھر کیا سکندر آغا کے کہنے کے مطابق غیروں میں؟ تو پھر وہ کون ہوگا؟ اور اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا' زیمل کا سراپا۔۔۔ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ ایک خوش شکل' وجیہہ' ذہین اور کامیاب بزنس مین' ایک خوش اخلاق شخص اور سب سے بڑھ کر اس کا وہ پرپوزل جسے میں نے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شخص تھا' میں نے اس کے بارے میں مزید کچھ معلومات بھی حاصل کی تھیں' وہ ہر لحاظ سے ایک ایسا شخص تھا جو کسی بھی باپ کا اپنی بیٹی کے لیے ایک خواب ہوگا۔

پھر میں خود ہی پرپوزل لے کر زیمل علی آفندی کے پاس گیا تھا۔ جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ "میرے دل کی رگیں سکڑ رہی ہیں' کسی بھی وقت مجھے ہارٹ

Zubinovelszone.com

اٹیک ہو سکتا ہے۔" تب میں نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ میں مرنے سے پہلے انا کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے' اسی لیے زحل میرے پاس انا کے لیے پہلی اور آخری پسند تھا۔

زحل کے لیے یہ بات یقیناً" حیران کن ہوگی کیونکہ میں خود ہی اس کا پرپوزل ٹھکرا چکا تھا' میں نے اس کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ انا کو اپنانے کے لیے میرا بزنس پارٹنر بن جائے۔

یہ بات یقیناً" اس کے لیے بہت غیر متوقع ہوگی اور یہاں پر میں نے اسے کچھ اور سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا' اسے بہت جلدی فیصلہ کرنا تھا' اسی وقت اور اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو میں چاہتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کئی سوال پوچھے گا لیکن اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ میں زحل کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا اور بغیر سوچے سمجھے میں اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتا تھا۔ اگر زحل نے خود انا کو پرپوز نہ کیا ہوتا تو شاید میرا دھیان بھی اس کی طرف نہ جاتا۔ یہی وہ چیز تھی جو مجھے اتنے شارٹ نوٹس پر کہیں اور نہیں مل سکتی تھی لیکن اندر ہی اندر میرا دل ڈر بھی رہا تھا۔ زحل امریکہ میں رہتا تھا جہاں سے اس کے بارے میں میرے پاس کوئی واضح معلومات نہیں تھیں۔ اگر وہ کوئی فراڈ ہوتا تو پھر؟ اسے اپنا بزنس پارٹنر بنانے کا فیصلہ کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ کہیں وہ انا کو لے کر فوراً" امریکہ نہ چلا جائے۔

میرا بزنس پارٹنر بننے کی شرط قبول کرنے کا مطلب تھا کہ وہ میری نظروں کے سامنے رہتا۔ وہ تب تک پاکستان نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میں نہ چاہتا۔ ایک لحاظ سے میں نے اسے پابند کر دیا تھا' اسے پابند کرنے کا مقصد انا کا بہتر مستقبل تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں نے چاہا تھا۔ درمیان میں کوئی مسئلہ نہیں آیا تھا' ایک بھاری بوجھ جیسے میرے کندھوں سے سرک گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

میں نے کبھی زحل سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ انا کو کیسے جانتا تھا' اس نے اسے پرپوز کیوں کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ انا زحل کو نہیں جانتی تھی۔ انا کے لیے زحل کا انتخاب کرنے کے بعد مجھے انا کا خیال آیا تو میں نے یہ بہتر سمجھا کہ انا بھی زحل سے مل لے۔ اگر وہ اسے پسند کر لیتی تو میرے سر سے یہ بوجھ بھی اتر جاتا کہ میں نے اس کی زندگی کا فیصلہ اس سے پوچھے بغیر کر لیا تھا۔

جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تو میں نے انا سے زحل کے بارے میں رائے لی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ حیران ہی رہ گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ انکار نہ کر دے لیکن کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میرا فیصلہ مان لیا اور مجھے زندگی کے اس مقام پر بھی معتبر کر دیا جس مقام پر معتبر ہونے کی خواہش سب والدین کرتے ہیں۔

جب وہ "انا اسفند" سے "انا زحل" بن گئی تب پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ وہ بالکل بھی سوشل نہیں تھی۔ اب تک وہ لوگوں سے گھلنے ملنے سے ہراساں رہتی تھی' لوگوں میں آکر بیٹھنے سے گریز کرتی تھی۔ زحل کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا اور یہ ٹھیک نہیں تھا جس شخص کے ساتھ اس نے اپنی پوری زندگی گزارنی تھی اس کے ساتھ اس کی انڈر اسٹینڈنگ بھی تو ہونی چاہیے تھی۔

زحل تو شاید میری وجہ سے خود انا سے ملنے نہیں آتا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ انا زحل سے ملے' اس سے دوستی کرے' اسی لیے ایک دن میں بغیر بتائے اسے زحل کے گھر بھی چھوڑ آیا تھا تاکہ اپنی زندگی کا باب وہ میری مدد کے بغیر پڑھے تاکہ اسے رشتوں کے تقاضے اور انہیں نبھانا آسکے۔

✲ ✲ ✲

پھر انا' میری لاڈلی بیٹی' میرے گھر کو اکیلا چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔ جس دن وہ رخصت ہوئی تھی' اس دن میں بالکل نہیں رویا تھا' اس کے فرض کی ادائیگی نے مجھے پُرسکون کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ زین کی عدم

موجودگی بھی میرے سکون کو متزلزل نہ کر سکی۔ اس کی کمی البتہ سارا وقت مجھے محسوس ہوتی رہی۔

یہ بیٹیاں اتنی جلدی بڑی کیسے ہو جاتی ہیں اور ایک دن وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی جاتی ہیں؟ انا کے بغیر میرے گھر کے درودیوار اداس تھے۔ میری طرح وہ بھی اس کی کمی محسوس کرتے تھے' میری طرح وہ بے جان درودیوار بھی میرے ساتھ روئے تھے' وہ بھی اسے یاد کرتے تھے۔

میں خود سے ایک ہی سوال بار بار کرتا تھا' ایک ہی سوال۔

کبھی کبھی ویران اسٹیشنوں پر رک کر
میں دیکھتا تھا' سوچتا تھا
لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی ہوئی ٹرین میں کوئی تمثیل ہے!
پر کیا ہے؟ یاد نہیں آتا تھا
اور جب یاد آیا
تو میں نے دیکھا کہ
پٹری کے ہاتھ خالی رہ گئے ہیں
سارے اسٹیشن سوالی رہ گئے ہیں
اب مجھے یاد آیا ہے
دور ہوتی ٹرین میں کیا تمثیل ہوتی ہے
مگر مجھے جاننا ہے کہ
میرا دل کیوں سوالی ہے؟
یہ رسم کس نے ڈالی ہے؟
پٹری کیوں خالی ہے؟
کیوں بیٹیاں مسافروں کی طرح ہوتی ہیں
کیوں بیٹیاں مسافروں کی طرح ہوتی ہیں؟....

✲ ✲ ✲

اس دن سب کچھ بدل گیا تھا۔ میرے اندازے' خواب' انا کے لیے کی ہوئی دعائیں سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ مدھم لہجے میں باتیں کرنے والا زحل یکسر بدل چکا تھا' اس کی نگاہیں شعلے برسا رہی تھیں' وہ مجھ سے لڑ رہا تھا' جھگڑ رہا تھا' وہ مجھ سے میری انیس سالوں کی ریاضت کا حساب لے رہا تھا' میری محبت' میری

تربیت کو الزام دے رہا تھا۔

"آپ نے اسے ابنارمل بنا دیا ہے۔ وہ آپ کے سوا دنیا کے ہر شخص سے خوفزدہ ہے۔ آپ نے اسے دنیا کے کسی شخص کا اعتبار کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کیوں کیا آپ نے یہ سب؟ وہ میری امانت تھی آپ کے پاس پھر آپ نے اسے اپنی ملکیت کیوں سمجھ لیا؟" وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"میری امانت۔" یہ زمل نے کہا تھا۔ ایسے جیسے وہ میری کچھ تھی ہی نہیں۔ مجھے چیلنج کرتا ہوا وہ زمل' اس زمل سے قطعی مختلف لگ رہا تھا جسے میں نے انا کے لیے چنا تھا' میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا تھا کہ جلد بازی میں میں انا کے لیے غلط فیصلہ کر چکا تھا۔ جسے انا میں اتنی خرابیاں نظر آ رہی تھیں' وہ انا کے ساتھ مخلص کیسے ہو سکتا تھا؟

انا کو تو اپنا حق کسی سے لینا ہی نہیں آتا تھا' یقیناً" اس بے وقوف لڑکی نے مجھ سے بھی سب کچھ چھپایا تھا۔ یہ غصے سے بپھرا ہوا شخص انا کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتا' میں نے انا کو اپنے پاس بلا لیا۔ اگر میں اپنی بیماری کا بہانہ نہ کرتا تو شاید وہ اسی زندان میں قید رہتی' غلامی کی عادت اسے ورثے میں جو ملی تھی۔ یقیناً" وہ زمل کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی آئی تھی ورنہ وہ اسے روک لیتا اور وہ رک جاتی۔

☼ ☼ ☼

اس دن جب انا نے مجھے بتایا کہ وہ زمل کا گھر چھوڑ آئی ہے تو مجھے اطمینان ہوا کہ وہ اپنا فیصلہ خود کر رہی تھی۔ وہ گھر اس نے کیوں چھوڑا تھا' اس کی وجہ میں جانتا تھا' ہاں زمل کو چھوڑنے کا فیصلہ کرنے میں' میں نے اس کی مدد کی تھی زمل کو اس کے لیے پسند بھی میں نے ہی کیا تھا اور اب اس سے نجات بھی میں ہی دلوانا چاہتا تھا لیکن یہ کیا ہوا تھا؟ اس کی آنکھوں میں وہ دھند کیوں پھیلی تھی؟ کیوں' وہ اتنی بکھری بکھری سی کیوں تھی؟ اور اب' اب سے تھوڑی دیر پہلے زمل یہاں آیا تھا' وہ بھی اس کی طرح ہی ٹوٹا پھوٹا لگ رہا تھا۔

شاید ایک بار پھر زمل کو سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی' شاید زمل بھی مجھے غلط سمجھا تھا' شاید نہیں' یقیناً"۔ جب میں نے اسے اپنا بزنس پارٹنر بنانے کے عوض اپنی بیٹی کا ہاتھ دیا تھا' اس وقت کوئی بھی شخص ہوتا وہ وہی سوچتا جو زمل نے سوچا ہو گا۔ میں تو اپنی پلاننگ پر مطمئن تھا' میں نے سوچا ہی نہیں کہ زمل میری بات سن کر مجھے کیسا انسان سمجھے گا؟ اور جب انا کو یہ سب معلوم ہو گا تو وہ کیا سوچے گی' کیا وہ اپنے باپ سے نفرت محسوس نہیں کرے گی؟ لیکن زمل کہہ رہا تھا کہ وہ انا کو سب کچھ بتا چکا ہے تو پھر اس نے مجھ سے نفرت کیوں نہیں کی؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے میرا فیصلہ چپ چاپ کیوں مان لیا؟

☼ ☼ ☼

آج پچیس سال بعد مجھے اس چھوٹے سے' بے ضرر سے' آسان سے جملے کا اصل مفہوم حقیقتاً" سمجھ آیا ہے۔ انا نے اپنے ہر فیصلے کو میری مرضی کا تابع کر کے اپنی زندگی کے سب سے اہم مقام پر ہمیشہ کی طرح مجھے معتبر کر کے مجھے سمجھا دیا ہے کہ بیٹی دعا ہوتی ہے یا بد دعا؟ کون کہتا ہے کہ بیٹی بد دعا ہوتی ہے' وہ تو سر سے پیر تک ایک نعمت ہے' رحمت ہے' سکھ کی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ ہم لوگ ساری زندگی اس پر اپنی مرضی تھوپتے رہتے ہیں۔ ساری زندگی وہ ہمارے فیصلے مانتی رہتی ہے۔ چپ چاپ' ہم سے محبت کر کے' ہمیں پوجتے پوجتے وہ ہمیں خدا بنا دیتی ہے اور جب ہم خدا بن جاتے ہیں تو ہمارے ظالمانہ فیصلوں کا سب سے پہلا شکار بھی وہ ہوتی ہے۔ جس نے ہمیں خدا بنایا ہوتا ہے۔

میں ایک باپ ہوں میں نے اپنی زندگی کے انیس سال اپنی بیٹی سے دیوانوں کی طرح محبت کی ہے' ایسی جنونی محبت' جس کی وجہ سے میں نے اپنے ہر رشتے کو داؤ پر لگا دیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں خود ہی اس کی خوشیاں چھین لوں' میں نے تو بارہا بارگاہِ الٰہی میں اس کی

خوشیوں کی دعائیں کی ہیں۔ میں ان خوشیوں کا گلا کیسے گھونٹ سکتا ہوں' کیسے؟۔۔۔

☼ ☼ ☼

دو دن پہلے مجھے اسفندیار آفندی نے فون کیا تھا' مجھے شدید حیرت ہوئی تھی' اس کی آواز سن کر پتا نہیں میں اتنا بے چین کیوں ہو گیا تھا؟ کسی انہونی کے احساس نے مجھے پاکستان آنے پر مجبور کیا تھا اور جب میں یہاں آیا تو میں اسفندیار آفندی سے ملا' اسفندیار آفندی' میرا باپ' وہ مغرور' ظالم' خود پسند' خود پرست شخص جس سے میں نے اپنی ساری زندگی نفرت کی تھی لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو وہ کوئی اور شخص تھا' جھکے جھکے کندھے سفید بال' کمزور وجود' ٹوٹا بکھرا سا وہ شخص جو انا کی تصویر کے پاس بیٹھا دیوانوں کی طرح اس سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

وہ شخص' وہ اسفندیار آفندی تو نہیں تھا جسے میں غرور اور انا کے کلف میں اکڑا ہوا چھوڑ کر گیا تھا اور جب وہ میرے شانوں پر سر رکھ کر رویا تو وہ ایک اجنبی شخص تھا جس سے میں اس دن پہلی بار ملا تھا۔ مجبور' شرمسار' بے بس' سر سے پیر تک ایک باپ' ایک عظیم باپ' جس نے ہمیشہ اپنی بیٹی کو اپنے بیٹے پر فوقیت دی تھی۔ میں جو سمجھتا تھا کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں' ایسا نہیں تھا۔

ساری زندگی اس کے ہر فیصلے کو رد کرنے کے باوجود میں اس سے نفرت نہیں کر پایا تھا۔

میں بچپن سے ہی ان کی توجہ کے لیے ترستا رہتا تھا' جب وہ میری بہن کے مقابلے میں مجھے ڈانٹتے تھے' مجھے فوقیت دینے کے بجائے اسے فوقیت دیتے تھے' تو میں انا سے بھی جل جاتا تھا' اس سے حسد کرنے لگتا تھا۔

لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کی زندگی کے کچھ گوشے مجھ پر بے نقاب ہوتے گئے۔ مجھے پتا چلا کہ یہ ایک ضدی اور انا پرست انسان ہیں' جو صرف اپنی بات منوانا جانتے ہیں' انا سے میرا حسد ہمدردی میں بدل گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو خود ان کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ میں ان سے دور ہوتا چلا گیا۔

اس وقت اپنے سامنے اس ٹوٹے ہارے ہوئے انسان کو میں پہچان نہیں پا رہا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔ انا کی زندگی کی بربادی کے لئے خود کو ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔

۔۔۔ اور انا' وہ بے وقوف لڑکی' پتا نہیں وہ اتنی بہادر کب سے ہو گئی ہے' اس نے تو بہادری کے سارے ریکارڈ ہی توڑ دیے ہیں۔ وہ تو چلو بے وقوف تھی ہی' یہ زمل کو کیا ہو گیا ہے۔ اچھا خاصا عقلمند ہوا کرتا تھا' پہلے میری ہمدردی میں آ کر انا سے شادی کر لی پھر محبت بھی کر لی لیکن جب محبت جتانے کا وقت آیا' جب محبت کا اجر ملنے کا وقت آیا' تب اپنا سب کچھ سمیٹ کر ہاتھ اٹھا کر ہار مان لی۔

شاید محبت نے عقل ماردی ہے اس کی' واقعی وہ بابا کی پسند ہی ہو سکتا تھا' گدھا کہیں کا۔ ان دونوں کے کان مجھے کھینچنے پڑیں گے' خود کو عقلِ کل کا مالک سمجھنے لگے ہیں۔ اب مجھے اور بابا کو ہی ان کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔

☼ ☼ ☼

ایک خوشحال گھر کا ایک خوبصورت منظر تھا۔ جب گلابی چہرے اور سنہری بالوں والی "انا زمل" نے جھک کر اپنی بھابھی کے پہلو سے اس معصوم پیاری سی بچی کو اٹھایا تھا جسے دنیا میں آئے چند گھنٹے ہوئے تھے۔

"بھابھی! میں اس کا نام "دعا" رکھوں گی' اچھا ہے ناں۔" بھابھی مسکرا دی تھیں' تب ہی عقب سے زین کی آواز آئی۔

"اس سے کیوں پوچھ رہی ہو' مجھ سے پوچھو کیونکہ آخری فیصلہ تو میرا ہی ہونا ہے۔" وہ جتاتے ہوئے انا کو چڑا رہا تھا۔

"کیوں' آپ کو اچھا نہیں لگا یہ نام۔ اتنا اچھا تو ہے' ہے ناں بابا؟" وہ اسفندیار آفندی کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی تائید چاہ رہی تھی' وہ مسکرا دیے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی پوتی کے لیے یہی نام سوچا تھا۔

"بابا سے کیوں پوچھ رہی ہو' وہ تو وہی کہیں گے جو تم چاہو گی۔" زین پھر درمیان میں بولا۔

"تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے اس نام پر۔" اب کی بار انا چڑ گئی۔

"ایسے ہی مفت میں رکھنے دوں میں تمہیں اس کا نام۔" وہ اس کی گود سے بیٹی کو پکڑتے ہوئے بولا۔

"ایک شرط پر رکھنے دوں گا میں تمہیں اس کا نام۔" وہ انا کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا اس سے اپنی شرط منوانا چاہتا تھا۔

"کون سی شرط؟" وہ اس طرح بولی تھی جیسے جو بھی شرط رکھے گا وہ فوراً اسے پورا کر دے گی۔

"شرط یہ ہے کہ۔۔۔" وہ رکا تھا' ہونٹوں میں اپنی مسکراہٹ دبا کر بولا۔ "کہ تمہارے بیٹے کا نام میں رکھوں گا۔" اور وہ جو غور سے اس کی بات سن رہی تھی' ایک دم جھینپ گئی تھی۔

زمل کی گہری نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں' وہ کچھ بول نہیں سکی تھی' تبھی زمل نے اس کی مشکل آسان کی۔ "اس سے کیوں پوچھ رہے ہو' مجھ سے پوچھو کیونکہ آخری فیصلہ تو میرا ہی ہونا ہے۔" اس نے زین کے جملے اسی کو لوٹائے تھے اور زین بھڑک اٹھا۔

"اسے کہتے ہیں یارِ غدار' نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا' وہ وقت بھول گئے جب بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے ناکام ہیرو کی طرح سیڈ سانگ گاتے پھرتے تھے اور یہ محترمہ! جو اس وقت اتنا چمک رہی ہیں' یہ اس طرح اپنے کمرے کو پیاری ہو گئی تھیں جیسے کالے قلعے میں کسی ظالم جادوگر کی قید میں ہوں۔"

"دیکھیں بابا! لالہ آپ کو ظالم جادوگر کہہ رہے ہیں۔" اس نے فوراً بات پکڑ کر اسفندیار آفندی سے زین کی شکایت لگائی۔

"اے لڑکی! کیوں اتنے محبت کرنے والے باپ بیٹے میں لڑائی کروا رہی ہو' سن لو بی بی! اب ہمارے درمیان کوئی پھوٹ نہیں ڈلوا سکتا۔" وہ اسے چیلنج کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا' یہ بات ہے' دیکھنا ابھی آپ کو بابا سے ڈانٹ پڑواتی ہوں۔" وہ پُرعزم انداز میں بولی۔

زمل نے بہت دلچسپی سے اسے دیکھا' کتنا بدل گئی تھی وہ۔ وہ پہلے والی انا تو لگتی ہی نہیں تھی' اسے کسی علاج کی ضرورت نہیں تھی' اسے صرف محبتوں کی' رشتوں کی اور محبتوں کے اعتماد کی ضرورت تھی۔

"پتا ہے بابا! اس دن جب لالہ ہمارے گھر آئے تھے تو انہوں نے بھابھی سے لڑائی کی تھی۔" وہ بھابھی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے بولی' یہی وہ ویک پوائنٹ تھا اس کے پاس زین کا جسے وہ اکثر اس کے خلاف استعمال کرتی رہتی تھی اور بابا سے اسے خوب ڈانٹ پڑواتی تھی۔

اس کی بات پر زین ایکدم سر پکڑ کر بیٹھ گیا' زمل نے تشویش سے پوچھا تھا۔ "کیا ہوا؟" زین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔" وہ بولا تھا۔

"کیا؟" زمل نے حیرت سے دیکھا۔

"سوچتا ہوں' زمانہ کتنا بدل گیا ہے' کتنی معصوم سی ہوتی تھی یہ جب اس گھر میں رہتی تھی اور تیری صحبت نے اسے کیسا پٹاخہ بنا دیا ہے۔" اس کے اس طرح پٹاخہ کہنے پر زمل قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"یہ میری صحبت کا نہیں بلکہ تیری شخصیت کا اثر ہے۔ آخر انسان بندہ دیکھ کر ہی بات کرتا ہے۔" زین زچ ہو گیا۔ اتنے شدید حملوں کا وہ متحمل نہیں ہو سکا تھا۔

"بابا! کہاں سے دریافت کیا تھا آپ نے اس۔۔۔ کو۔" اس نے گدھے کی جگہ خالی چھوڑ کر کہا تھا۔

"آپ بھول رہے ہیں لالہ! بابا نے نہیں' آپ نے ڈھونڈا تھا۔" زین کے جملے پر غور کیے بغیر انا نے جیسے اس کی بات پکڑی تھی' بے اختیار ہی زین کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔ زمل اسے گھور کر رہ گیا۔

"ہاں تو انا! تم کیا کہہ رہی تھیں' کیا کہہ رہا تھا زین عمارہ بھابھی سے؟" زمل انتقامی کارروائیوں کے طور

پر انا کا رخ پھر اسی بات کی طرف پھیر گیا تھا۔ زین اسے روکتا ہی رہ گیا تھا اور وہ پورے خشوع و خضوع سے اس کی ساری شکایتیں اسفندیار آفندی کو لگاتی جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ بابا ان کی سفارشات کی روشنی میں مقدمے کا فیصلہ سناتے' کمرے میں کسی کے رونے کی آواز آئی تھی۔ انا جو پوری طرح سے مصروف تھی' ایک دم چونک گئی۔

"ارے یہ کون رویا؟" اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"میری بیٹی ہے' مجھے تمہارے عذاب سے بچانے آئی ہے۔" زین جیسے چڑ کر بولا تھا' انا بے اختیار ہنس دی تھی۔ اور وہ تھی کہ خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے' مجھ سے اس کا نام رکھنے میں غلطی ہو گئی ہے' اس کا نام تو "شاہین میزائل" رکھنا چاہیے تھا۔" وہ اس کے روں روں کر کے رونے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلو میری بیٹی کا نام تو "شاہین میزائل" ہی ٹھیک ہے۔ جب تمہارا بیٹا ہو گا ناں تو اس کا نام تو میں "ایٹمک میزائل" رکھوں گا۔" وہ پُرعزم انداز میں بولا تو سارے لوگ بے اختیار ہنس دیے تھے۔

"ویسے مجھے تو یہ نام پسند آیا ہے' تمہارا کیا خیال ہے؟" زمل کی سرگوشی صرف انا ہی سن سکی تھی' اس کی گہری نظروں نے اس کی چلتی زبان کو بریک لگا دیے تھے' ساری تیزی' طراری' ہوا ہو گئی تھی۔

تب ہی اسفندیار آفندی نے روتی ہوئی دعا کو اپنی گود میں اٹھایا تھا اور ان کی گود میں آتے ہی وہ ایکدم خاموش ہو گئی تھی' جیسے اسے اسی گود کی تلاش تھی۔ سب حیران رہ گئے تھے۔

اسفندیار آفندی کا چہرہ دھیرے سے جھکا تھا اور پھر انہوں نے آگے بڑھ کر اس ننھی سی پیشانی کو چوم لیا تھا۔

انہیں لگا کہ بیس سال پہلے وہ جو کام نہیں کر سکے تھے' وہ آج کیا تھا۔ انہوں نے "دعا" نہیں "انا" کی پیشانی کو چوما تھا۔ سکھ' اطمینان' سکون اور تکمیل کا ایک گہرا احساس ان کی روح میں اتر گیا تھا اور تین گھنٹے کی معصوم "دعا" اس لمس کو پا کر میٹھی نیند سو گئی تھی۔

آسمانوں سے اتری ہوئی ایک اور دعا' جنت کے فرشتوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے گہری نیند میں مسکرا دی تھی' اس کی مسکراہٹ کی روشنی نے وہاں موجود ہر شخص کے دل کو روشن کر دیا تھا۔